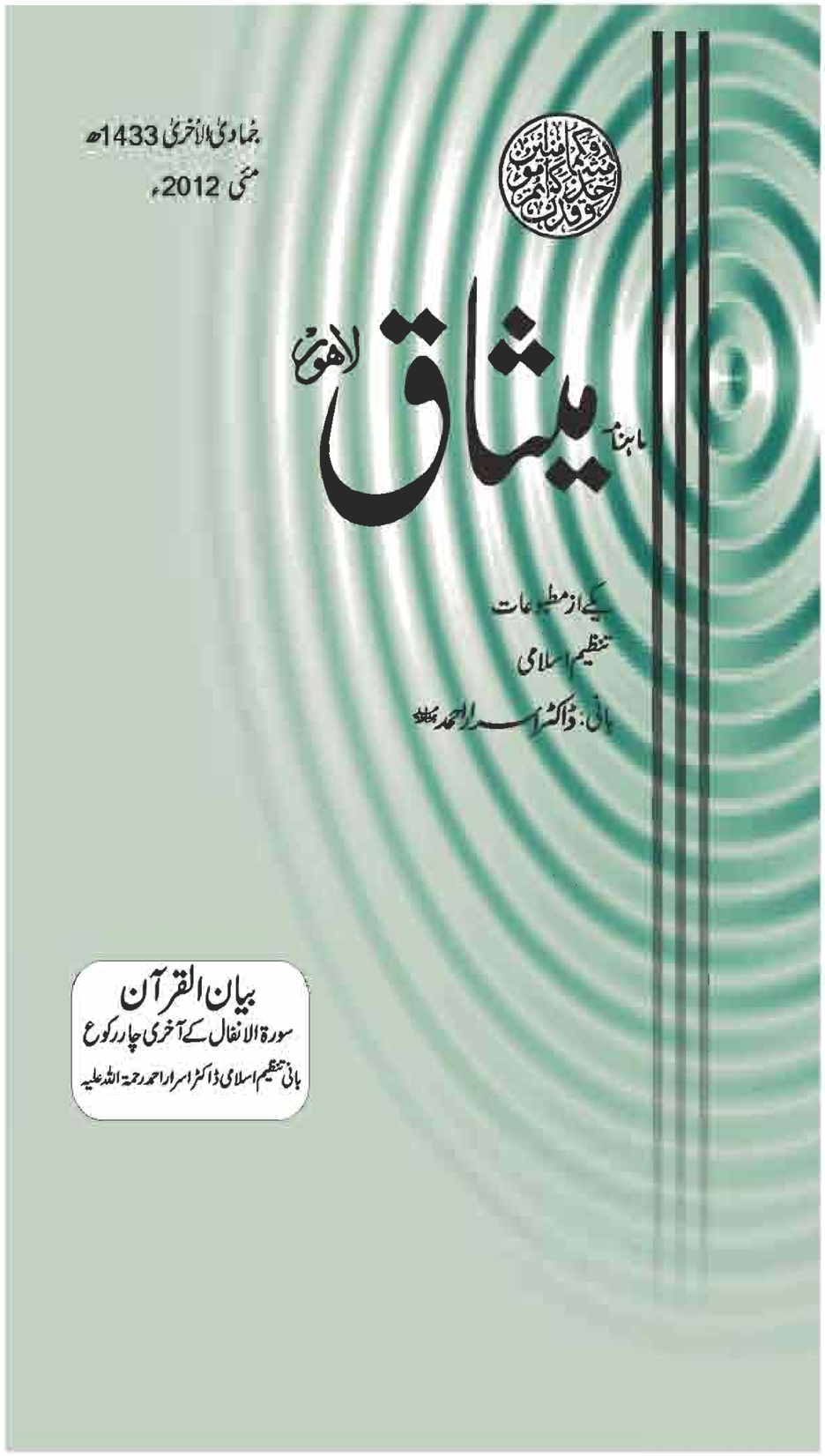

اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا؟

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَيْفَ بِكُمْ اِذَا طَغٰى نِسَاؤُكُمْ وَفَسَقَ شُبَّانُكُمْ وَتَرَكْتُمْ جِهَادَكُمْ!)) قَالُوْا: وَاِنَّ ذٰلِكَ لَكَائِنٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((نَعَمْ، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَاَشَدُّ مِنْهُ سَيَكُوْنُ)) قَالُوْا: وَمَا اَشَدُّ مِنْهُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا لَمْ تَاْمُرُوْا بِمَعْرُوْفٍ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنْ مُنْكَرٍ!)) قَالُوْا: وَكَائِنٌ ذٰلِكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((نَعَمْ، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَاَشَدُّ مِنْهُ سَيَكُوْنُ)) قَالُوْا: وَمَا اَشَدُّ مِنْهُ؟ قَالَ: ((كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا رَاَيْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْكَرًا وَالْمُنْكَرَ مَعْرُوْفًا!)) قَالُوْا: وَكَائِنٌ ذٰلِكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((نَعَمْ، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَاَشَدُّ مِنْهُ سَيَكُوْنُ)) قَالُوْا: وَمَا اَشَدُّ مِنْهُ؟ ((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَاَشَدُّ مِنْهُ سَيَكُوْنُ، يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: بِيْ حَلَفْتُ لَاُتِيْحَنَّ لَهُمْ فِتْنَةً يَصِيْرُ الْحَلِيْمُ فِيْهَا حَيْرَانَ!)) (تخریج الاحیاء للعراقی ۲/ ۳۸۰)

’’اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہاری عورتیں تمام حدود پھلانگ جائیں گی اور تمہارے نوجوان بدکردار ہو جائیں گے اور تم جہاد ترک کر دو گے!‘‘ لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ کیا ایسا بھی ہونے والا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اور قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے‘ اُس سے بھی بدتر حالات رونما ہوں گے‘‘۔ لوگوں نے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ اس سے بدتر حالات کیا ہوں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’اُس وقت تمہارے کیا حالات ہوں گے جب تم معروف کا حکم نہ دو گے اور منکرات سے منع نہیں کرو گے!‘‘ لوگوں نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ کیا ایسا بھی ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ہاں! اور قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے‘ اس سے بھی بدتر حالات رونما ہوں گے۔‘‘ لوگوں نے دریافت کیا کہ مزید بدتر حالات کیا ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تمہارے حالات کیا ہوں گے جب تم بھلائی کو برائی اور برائی کو بھلائی سمجھنے لگو گے!‘‘ لوگوں نے (حیرانی سے) پوچھا: ’’اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ایسا بھی ہو جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ہاں! اور قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے‘ اس سے بھی سخت تر حالات ہوں گے‘‘۔ لوگوں نے (پریشان ہو کر) پوچھا کہ وہ کیا حالات ہوں گے؟ (فرمایا:) ’’قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے‘ اس سے بھی شدید تر حالات رونما ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ’’میں اپنے جلال کی قسم کھاتا ہوں کہ (لوگوں کے کرتوتوں کے سبب) میں ان پر ایسا فتنہ مسلّط کر دوں گا کہ سمجھ دار اور حلیم لوگ بھی اس میں حیران و سرگرداں رہ جائیں گے!‘‘

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ مِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	61
شمارہ :	5
جمادی الاخریٰ	1433ھ
مئی	2012ء
فی شمارہ	25/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ———— 3
کیا ہونے کو ہے؟
ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ———— 5
سورۃ الانفال (آیات ۴۹ تا ۷۵)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت ———— 28
تفکّر: معرفتِ حق کا اہم ذریعہ
عتیق الرحمٰن صدیقی

تعلیم و تعلّم ———— 37
- حصولِ علم کی فرضیت، اہمیت اور فضیلت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
- سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کا ایک مطالعہ — حافظ محمد مشتاق ربانی — 47

دعوتِ فکر ———— 55
حقوق و فرائض
اُمِّ عمار عبدالخالق

اقبالیات ———— 65
کلامِ اقبال: قرآن کے ترازو میں (۴)
پروفیسر عبداللہ شاہین

تحریکِ تجدّد و متجدّدین ———— 79
مولانا وحید الدین خان: اپنے الفاظ کے آئینے میں (۳)
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

کیا ہونے کو ہے؟

وزیراعظم کے خلاف توہین عدالت کیس کی طویل اور اکتا دینے والی سماعت بالآخر ختم ہوگئی ہے اور سپریم کورٹ نے فیصلہ محفوظ رکھ لیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ یہ سطور قارئین کی نظروں سے گزریں فیصلے کا اعلان ہو چکا ہوگا۔ حکومت نے جس انداز میں اور جس ڈھٹائی سے سپریم کورٹ کے احکامات کو نظرانداز کیا بلکہ تعمیل سے صاف صاف انکار کر دیا اس حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ ممکن ہی نظر نہیں آتا کہ سپریم کورٹ وزیراعظم کو باعزت بری کر دے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جس روز فیصلہ سنایا جائے وزیراعظم کو طلب کر کے ایک اور موقع فراہم کیا جائے کہ وہ سوئس کورٹ کو خط لکھنے کا ارادہ ظاہر کر دیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں توہین عدالت کا یہ کیس ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کے علاوہ کسی دوسری صورت میں جس طرح سپریم کورٹ کے لیے وزیراعظم کو سزا دینا' چاہے وہ محض چند منٹوں کے لیے عدالت کے برخاست ہونے تک قید کی سزا ہو' یا جرمانے کی سزا ہو' یا اسمبلی سے رکنیت کے خاتمے کی سزا ہو' عدالت کی مجبوری ہے' لہٰذا وزیراعظم کا مکمل طور پر باعزت بری ہونا ممکن نہیں ہے' اسی طرح حکومت بشمول صدر نے سوئس کورٹ کو خط لکھنے سے جس طرح مسلسل اور واضح انکار کیا ہے اب اس سٹیج پر خط لکھنے پر رضامند ہو جانا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ گویا ایک نئے سیاسی بحران کا پیدا ہونا لازم ہے اور پاکستان کا مقدر معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ وزیراعظم کے وکیل اعتزاز احسن نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے کہ جیل جانے کی صورت میں بھی وزیراعظم کی کرسی کو کوئی خطرہ نہیں اور وہ جیل سے یہ ذمہ داری نبھاتے رہیں گے' کیونکہ سزا ہونے کے باوجود اُن کی اہلیت برقرار رہے گی' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بچگانہ اور مضحکہ خیز موقف ہے۔ وزیراعظم پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں کہ اگر اُنہیں سزا ہوئی تو وہ صدر سے معافی کی درخواست نہیں کریں گے۔ ایسا اس لیے بھی ممکن نہیں ہوگا کیونکہ صدر مملکت کسی کی سزا صرف اُس صورت میں معاف کر سکتے ہیں جب وزیراعظم اُنہیں ایسا کرنے کی سفارش کرے۔

عام حالات ہوں' عام ملک ہو تو کسی سیاسی بحران کا خطرہ نہیں ہونا چاہیے' کیونکہ حکمران

پارٹی قومی اسمبلی میں اپنا نیا لیڈر چُن لے گی اور کام smoothly چلتا رہے گا' لیکن وطن عزیز کو اور اہلِ وطن کو' خصوصاً حکمرانوں کو بحرانوں سے' ہنگامی اور غیر معمولی حالات سے ایسا لگاؤ پیدا ہو چکا ہے کہ کچھ عرصہ اگر ملک میں کوئی بحران جنم نہ لے تو یہ سب اُداس اور بے کار ہو جاتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں تو یہ مسئلہ بھی ہے کہ کیا پاکستان پیپلز پارٹی کا نامزد کوئی دوسرا وزیراعظم سوئس عدالت کو خط لکھنے کا حکم تسلیم کر لے گا؟ اگر کر لے گا تو کیا پاکستان پیپلز پارٹی کو یوسف رضا گیلانی سے ہی دشمنی تھی؟ اور اگر نہیں کرے گا تو یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا؟ کیا ہر دوسرے مہینے نیا وزیراعظم توہین عدالت کی سزا بھگتے گا؟ پھر یہ کہ ایم کیو ایم' اے این پی' مسلم لیگ (ق) حکومتی کرسی کے دوسرے تین پائے ہیں۔ اگر ان میں ایک یا دو پائے نئے وزیراعظم کے انتخاب کے موقع پر ٹوٹ گئے تو پھر کیا ہوگا؟ ہم پاور پالیٹکس اور اقتدار کی رسّہ کشی سے دور رہنے والوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارے لیے یہ ''گاؤ آمد وخر رفت اور خر آمد وگاؤ رفت'' والا معاملہ ہے۔ البتہ ملکی حالات خصوصاً موجودہ علاقائی اور عالمی صورت حال کے تناظر میں آنے والے دنوں میں داخلی سیاست میں کھیلے جانے والا انتہائی گندا کھیل ہماری پریشانی میں اضافے کا موجب بن سکتا ہے۔

ملک کے معاشی حالات' امن وامان کی حد درجہ بدحالی' جگہ جگہ ہونے والی تخریبی اور دہشت گردی کی کارروائیاں' بجلی اور گیس کی بدترین لوڈ شیڈنگ' مہنگائی اور بے روزگاری سے عوام میں پھیلنے والی بے چینی' کراچی میں ٹارگٹ کلنگ' بلوچستان میں قتل وغارت کے ساتھ ساتھ پاکستان سے لاتعلقی بلکہ علیحدگی کے رجحانات' صوبائی اور لسانی تعصّبات' نئے صوبوں کے قیام کے حوالے سے باہم چپقلش اور خارجی سطح پر نیٹو سپلائی کی بحالی کا مسئلہ اور اس حوالہ سے امریکہ سے کشیدگی' یہ سب کچھ انتہائی پریشان کن ہے۔ پھر یہ کہ بھارت جیسا ہمسایہ جو پہلے دن سے پاکستان کی آزادی اور خودمختاری پر شب خون مارنے کے لیے تاک میں رہتا ہے' ہماری سلامتی کے حوالہ سے بڑے مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق راجستھان میں پاکستان کی سرحد کے قریب بھارت اپنی تاریخ کی سب سے بڑی جنگی مشقیں کر رہا ہے۔ اسرائیل ہمارے ایٹمی اثاثہ جات کی وجہ سے ہمارا بدترین دشمن ہے اور ماضی میں بھارت کے ساتھ مل کر انہیں تباہ کرنے کی کئی ناکام کوششیں کر چکا ہے' وہ بھی ہم پر کاری ضرب لگانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ امریکہ' بھارت اور اسرائیل کا

(باقی صفحہ 95 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورَۃُ الاَنفَال

آیات ۴۹ تا ۵۸

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۴۹﴾ وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡہَہُمۡ وَاَدۡبَارَہُمۡ ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۵۱﴾ کَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ۙ وَاَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۳﴾ کَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ فَاَہۡلَکۡنٰہُمۡ بِذُنُوۡبِہِمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ ۚ وَکُلٌّ کَانُوۡا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۵﴾ الَّذِیۡنَ عٰہَدۡتَّ مِنۡہُمۡ ثُمَّ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَہُمۡ فِیۡ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّہُمۡ لَا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّہُمۡ فِی الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِہِمۡ مَّنۡ خَلۡفَہُمۡ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡہِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾

آیت ۴۹ ﴿اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ﴾ ’’جب کہہ رہے تھے

منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا‘‘

ابھی تک ایک طرف کے حالات کا نقشہ پیش کیا جا رہا تھا۔ یعنی لشکرِ قریش کی مکہ سے روانگی‘ اس لشکر کی کیفیت‘ ان کے سرداروں کے متکبرانہ خیالات‘ شیطان کا ان کی پیٹھ ٹھونکنا اور پھر عین وقت پر بھاگ کھڑے ہونا۔ اب اس آیت میں مدینہ کے حالات پر تبصرہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ سے لشکر لے کر نکلے تو پیچھے رہ جانے والے منافقین کیا کیا باتیں بنا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

﴿غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ؕ﴾ ’’اِن (مسلمانوں) کو تو ان کے دین نے بالکل دھوکے میں ڈال دیا ہے‘‘

یعنی ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو قریش کے اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کرنے چل پڑے ہیں۔ ہم تو پہلے ہی ان کو سُفَہَاء (احمق) سمجھتے تھے‘ مگر اب تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دین کے پیچھے بالکل ہی پاگل ہو گئے ہیں۔

﴿وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۴۹﴾﴾ ’’اور (انہیں کیا پتا کہ) جو کوئی توکّل کرتا ہے اللہ پر تو اللہ زبردست ہے‘ حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۵۰ ﴿وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓئِکَۃُ﴾ ’’اور کاش تم دیکھ سکتے جب قبض کرتے ہیں فرشتے ان کافروں کی جانوں کو‘‘

﴿یَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡہَہُمۡ وَاَدۡبَارَہُمۡ ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۵۰﴾﴾ ’’ضربیں لگاتے ہوئے اُن کے چہروں اور اُن کی پیٹھوں پر‘ اور (کہتے ہیں کہ اب) چکھو جلنے کا عذاب۔‘‘

آیت ۵۱ ﴿ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۵۱﴾﴾ ’’یہ وہ کچھ ہے جو تمہارے اپنے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور اللہ تو ہرگز اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔‘‘

آیت ۵۲ ﴿کَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ﴾ ’’(ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوا) جیسے کہ معاملہ ہوا آلِ فرعون کا اور اُن لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے۔‘‘

آلِ فرعون سے پہلے قومِ شعیبؑ تھی‘ قومِ شعیبؑ سے پہلے قومِ لوطؑ‘ اُن سے پہلے قومِ ثمود‘

اُن سے پہلے قومِ عاد اور اُن سے پہلے قومِ نوحؑ۔ ان ساری قوموں کے انجام کے بارے میں ہم سورۃ الاعراف میں پڑھ چکے ہیں۔

﴿كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ﴾ ''انہوں نے اللہ کی آیات کا کفر کیا' تو اللہ نے انہیں پکڑ لیا اُن کے گناہوں کی پاداش میں۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ ''یقیناً اللہ قوی ہے اور سزا دینے میں سخت ہے۔''

آیت ۵۳ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ﴾ ''یہ اس لیے کہ اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ کوئی نعمت جو اُس نے کسی قوم کو دی ہو اُس میں تغیّر کرے جب تک کہ وہ قوم اپنی اندرونی کیفیت کو متغیّر نہ کر دے''

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف اپنا پیغمبر مبعوث کیا' جس نے اللہ کی توحید اور اس کے احکام کے مطابق اس قوم کو دعوت دی۔ پیغمبر کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے نوازا' اُن پر اپنے انعامات واحسانات کی بارشیں کیں۔ پھر اپنے پیغمبر کے بعد ان لوگوں نے آہستہ آہستہ کفر وضلالت کی روش اختیار کی اور توحید کی شاہراہ کو چھوڑ کر شرک کی پگڈنڈیاں اختیار کر لیں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں نے بھی اُن سے منہ موڑ لیا' انعامات کی جگہ اللہ کے عذاب نے لے لی اور یوں وہ قوم تباہ و برباد کر دی گئی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پر سوار ہونے والے مؤمنین کی نسل سے ایک قوم وجود میں آئی۔ جب وہ قوم گمراہ ہوئی تو حضرت ہود علیہ السلام کو اُن کی طرف بھیجا گیا۔ پھر حضرت ہود علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی نسل سے ایک قوم نے جنم لیا اور پھر جب وہ لوگ گمراہ ہوئے تو اُن کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ گویا ہر قوم اسی طرح وجود میں آئی' مگر اللہ تعالیٰ نے کسی قوم سے اپنی نعمت اُس وقت تک سلب نہیں کی جب تک کہ خود انہوں نے ہدایت کی راہ کو چھوڑ کر گمراہی اختیار نہیں کی۔ یہ مضمون بعد میں سورۃ الرعد (آیت ۱۱) میں بھی آئے گا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس مضمون کو ایک خوبصورت شعر میں اس طرح ڈھالا ہے: ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

اس فلسفے کے مطابق جب کوئی قوم محنت کو اپنا شعار بنا لیتی ہے تو اس کے ظاہری حالات

میں مثبت تبدیلی آتی ہے اور یوں اس کی تقدیر بدلتی ہے۔ صرف خوش فہمیوں (wishful thinkings) اور دعاؤں سے قوموں کی تقدیریں نہیں بدلا کرتیں' اور قوم چونکہ افراد کا مجموعہ ہوتی ہے' اس لیے تبدیلی کا آغاز افراد سے ہوتا ہے۔ پہلے چند افراد کی قلب ماہیت ہوتی ہے اور اُن کی سوچ' اُن کے نظریات' اُن کے خیالات' اُن کے مقاصد' اُن کی دلچسپیاں اور اُن کی امنگیں تبدیل ہوتی ہیں۔ جب ایسے پاک باطن لوگوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی ہے اور وہ لوگ ایک طاقت اور قوت کے طور پر خود کو منظّم کر کے باطل کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو طاغوتی طوفان اپنا رُخ بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یوں اہلِ حق کی قربانیوں سے نظام بدلتا ہے' معاشرہ پھر سے راہِ حق پر گامزن ہوتا ہے اور انقلاب کی سحر پُرنور طلوع ہوتی ہے۔ لیکن یاد رکھیں اِس انقلاب کے لیے فکری و عملی بنیاد اور اس کٹھن سفر میں زادِ راہ کی فراہمی صرف اور صرف قرآنی تعلیمات سے ممکن ہے۔ اسی سے انسان کے اندر کی دنیا میں انقلاب آتا ہے۔ اسی اکسیر سے اُس کی قلب ماہیت ہوتی ہے اور پھر مٹی کا یہ انبار یکایک شمشیر بے زنہار کا روپ دھار لیتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس لطیف نکتے کی وضاحت اس طرح کی ہے: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دِیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یعنی جب یہ قرآن کسی انسان کے دل کے اندر اتر جاتا ہے تو اس کے دل اور اس کی روح کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اور ایک بندۂ مؤمن کے اندر کا یہی انقلاب بالآخر عالمی انقلاب کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ ''اور یہ کہ اللہ سب کچھ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

آیت ۵۴ ﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ﴾ ''جیسا کہ معاملہ ہوا آلِ فرعون کا اور جو اُن سے پہلے تھے۔''

﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ﴾ ''انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے اُن کو ہلاک کر ڈالا اُن کے گناہوں کی پاداش میں''

﴿وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴾ ''اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کر دیا' اور یہ سب کے سب ظالم تھے۔''

آیت ۵۵ ﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ ''یقیناً

بدترین چوپائے اللہ کے نزدیک یہی لوگ ہیں جو کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔‘‘

یہی بات اس سے پہلے ہم سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۹ میں بھی پڑھ چکے ہیں کہ یہ لوگ انسان نظر آتے ہیں‘ حقیقت میں انسان نہیں ہیں: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ یعنی حقیقت میں وہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے ہیں۔ ان ہی لوگوں کو یہاں ’’شَرَّ الدَّوَآب‘‘ کہا گیا ہے‘ کہ یہی وہ حیوان نما انسان ہیں جو تمام جانوروں سے برے ہیں۔ جو عقل‘ شعور اور ایمان کی نعمتوں کے مقابلے میں کفر کی روش اختیار کر کے دنیا کی لذتوں پر ریجھ گئے ہیں۔

آیت ۵۶ ﴿اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝۵۶﴾ ’’وہ لوگ جن سے (اے نبی ﷺ) آپ نے معاہدہ کیا تھا‘ پھر وہ ہر مرتبہ اپنا عہد توڑ دیتے ہیں اور وہ (اس بارے میں) ڈرتے نہیں ہیں۔‘‘

یہ اشارہ یہودِ مدینہ کی طرف ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے آتے ہی یہودیوں سے مذاکرات شروع کیے اور نتیجتاً مدینہ کے تینوں یہودی قبائل سے شہر کے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کر لیا۔ پروفیسر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء تا ۲۰۰۶ء) نے اس معاہدے کو آپ ﷺ کا ایک بہت بڑا مدبرانہ کارنامہ قرار دیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں آپؐ کی معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ظاہری طور پر اگرچہ یہودی اس معاہدے کے پابند تھے مگر خفیہ طور پر مسلمانوں کے خلاف سازشوں سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ انہوں نے ہر مشکل مرحلے پر اس معاہدے کا پاس نہ کرتے ہوئے آپؐ کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کی‘ حتیٰ کہ غزوۂ احزاب کے انتہائی نازک موقع پر قریش کو خفیہ طور پر پیغامات بھجوائے کہ آپ لوگ باہر سے شہر پر حملہ کر دیں‘ ہم اندر سے تمہاری مدد کریں گے۔

آیت ۵۷ ﴿فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۵۷﴾ ’’تو اگر آپؐ انہیں جنگ میں پا جائیں تو ان کو ایسی سزا دیں کہ جو ان کے پیچھے ہیں ان کو بھی خوف زدہ کر دیں‘ تاکہ وہ عبرت حاصل کریں۔‘‘

یہ یہودی آپ لوگوں کے خلاف کُفّارِ مکّہ کے ساتھ مل کر خفیہ طور پر سازشیں تو ہر وقت کرتے ہی رہتے ہیں‘ لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگ میدانِ جنگ میں بھی پکڑے جائیں کہ وہ

قریش کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں ان کو ایسی عبرت ناک سزا دو کہ قریش مکہ جو پیچھے بیٹھ کر ان کی ڈوریں ہلا رہے ہیں اور اِن سازشوں کی منصوبہ بندیاں کر رہے ہیں اُن کے ہوش بھی ٹھکانے آ جائیں۔

آیت ۵۸ ﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ﴾ ’’اور اگر آپؐ کو اندیشہ ہو جائے کسی قوم کی طرف سے بدعہدی کا تو پھینک دیجیے (ان کا معاہدہ) ان کی طرف کھلم کھلا۔‘‘

پچھلی آیات میں انفرادی فعل کے طور پر معاہدے کی خلاف ورزی کا ذکر تھا۔ مثلاً کسی قبیلے کا کوئی فرد اس طرح کی کسی سازش میں ملوث پایا جائے تو ممکن ہے ایسی صورت میں اس کے قبیلے کے لوگ یا سردار اس سے بریٔ الذمہ ہو جائیں کہ یہ اس شخص کا ذاتی اور انفرادی فعل ہے اور اجتماعی طور پر ہمارا قبیلہ بدستور معاہدے کا پابند ہے۔ لیکن اس آیت میں قومی سطح پر اس مسئلے کا حل بتایا گیا ہے کہ اے نبی ﷺ! اگر آپ کو کسی قوم یا قبیلے کی طرف سے معاہدے کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں آپ ان کے معاہدے کو علی الاعلان منسوخ (abrogate) کر دیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اخلاق کے جس معیار پر دیکھنا چاہتا ہے اس میں یہ ممکن نہیں کہ بظاہر معاہدہ بھی قائم رہے اور اندرونی طور پر ان کے خلاف اقدام کی منصوبہ بندی بھی ہوتی رہے‘ بلکہ ایسی صورت میں آپ ﷺ کھلم کھلا یہ اعلان کر دیں کہ آج سے میرے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔

مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۸ء میں جہادِ کشمیر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اسی قرآنی حکم کی روشنی میں کیا تھا‘ کہ ہندوستان کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات کے ہوتے ہوئے یہ اقدام قرآن اور شریعت کی رو سے غلط ہے اور اسلام کے نام پر بننے والی مملکت کی حکومت کو ایسی پالیسی زیب نہیں دیتی۔ پاکستان کو اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی پالیسی کا کھلم کھلا اعلان کرنا چاہیے۔ میز کے اوپر باہمی تعاون کے معاہدے کرنا‘ دوستی کے ہاتھ بڑھانا اور میز کے نیچے سے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنا دنیاداروں کا وطیرہ تو ہو سکتا ہے اہلِ ایمان کا طریقہ نہیں۔ مولانا مودودیؒ کی یہ رائے اگرچہ اس آیت کے عین مطابق تھی مگر اُس وقت اُن کی اس رائے کے خلاف عوام میں خاصا اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝۵۸﴾ ’’یقیناً اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

آیات ۵۹ تا ۶۶

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا
اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ
وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ
لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ
يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾
وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ
قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ
اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى
الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اَلْـٰٔنَ
خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ
يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ
الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

آیت ۵۹ ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ﴾ ’’اور نہ سمجھیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ وہ بچ نکلے ہیں۔‘‘

غزوۂ بدر میں کفار کے ایک ہزار افراد میں سے بہت سے لوگ صحیح سلامت بچ بھی نکلے تھے۔ یہ اُن کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے ہیں۔

﴿اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ’’وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکیں گے۔‘‘

وہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکیں گے۔

آیت ۶۰ ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾ ’’اور تیار رکھو اُن

کے (مقابلے کے) لیے اپنی استطاعت کی حد تک طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے‘‘

یہاں مسلمانوں کو واضح طور پر حکم دیا جا رہا ہے کہ اب جبکہ تمہاری تحریک تصادم کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے تو تم لوگ اپنے وسائل کے مطابق‘ مقدور بھر فنِ حرب کی صلاحیت و اہلیت‘ اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ جہاد کے لیے تیار رکھو۔ اگرچہ ایک مؤمن کو اللہ کی نصرت پر توکل کرنا چاہیے‘ مگر توکل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور امید رکھے کہ سب کچھ اللہ کی مدد سے ہی ہو جائے گا۔ بلکہ توکّل یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق اپنے تمام ممکنہ مادی اور تکنیکی وسائل مہیا رکھے جائیں اور پھر اللہ کی نصرت پر توکل کیا جائے۔

یہاں مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے خلاف بھرپور دفاعی صلاحیت حاصل کرنے کی حتّی الوسع کوشش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تیاری کا یہ حکم ہر دور کے لیے ہے۔ آج اگر اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے نوازا ہے تو یہ صلاحیت ملک و قوم کی قوت و طاقت کی علامت بھی ہے اور تمام عالم اسلام کی طرف سے پاکستان کے پاس ایک امانت بھی۔ اگر اس سلسلے میں کسی دباؤ کے تحت‘ کسی بھی قسم کا کوئی سمجھوتہ (compromise) کیا گیا تو یہ اللہ‘ اس کے دین اور تمام عالم اسلام سے ایک طرح کی خیانت ہوگی۔ لہٰذا آج وقت کی یہ اہم ضرورت ہے کہ پاکستانی قوم اپنے دشمنوں سے ہوشیار رہتے ہوئے اس سلسلے میں جرأت مندانہ پالیسی اپنائے‘ تاکہ اس کے دشمنوں کے لیے ایٹمی ہتھیاروں کی صورت میں قوتِ مزاحمت کا توازن (deterrence) قائم رہے۔

﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ ’’(تاکہ) تم اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ڈرا سکو‘‘

﴿وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ﴾ ’’اور کچھ دوسروں کو (بھی) جو ان کے علاوہ ہیں‘ تم انہیں نہیں جانتے‘ اللہ انہیں جانتا ہے۔‘‘

یعنی تمہاری آستینوں کے سانپ منافقین جو در پردہ تمہاری تباہی اور بربادی کے درپے رہتے ہیں۔ تمہاری نظروں سے تو وہ چھپے ہوئے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾﴾

’’اور جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا ثواب پورا پورا تمہیں دیا جائے گا اور تم پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔‘‘

یعنی اگر اسلحہ خریدنا ہے‘ ساز و سامان فراہم کرنا ہے‘ گھوڑے تیار کرنے ہیں تو اس سب کچھ کے لیے اخراجات تو ہوں گے۔ لہٰذا جنگی تیاری کے ساتھ ہی انفاق فی سبیل اللہ کا حکم بھی آ گیا‘ اس ضمانت کے ساتھ کہ جو کوئی جتنا بھی اس سلسلے میں اللہ کے رستے میں خرچ کرے گا اس کو وعدے کے مطابق پورا پورا اجر دیا جائے گا اور کسی کی ذرّہ برابر بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔ یہاں انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳۶ اور ۳۷ میں دیے گئے اَحکام کو ذہن میں دوبارہ تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! اب تمہاری تحریک کا وہ مرحلہ شروع ہو چکا ہے جہاں تمہارا جنگ کے لیے ممکن حد تک تیاری کرنا اور کیل کانٹے سے لیس ہونا ناگزیر ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب آگے بڑھو اور اس عظیم مقصد کے لیے دل کھول کر خرچ کرو۔ اللہ تمہیں ایک کے بدلے سات سو تک دینے کا وعدہ کر چکا ہے‘ بلکہ یہ بھی آخری حد نہیں ہے۔ جذبۂ ایثار و خلوص جس قدر زیادہ ہوگا یہ اجر و ثواب اسی قدر بڑھتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اپنا مال سینت سینت کر رکھنے کے بجائے اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالو‘ تاکہ دنیا میں اللہ کے دین کے غلبے کے لیے کام آ جائے اور آخرت میں تمہاری فلاح کا ضامن بن جائے۔

آیت ۶۱ ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) اگر وہ اپنے بازو جھکا دیں امن کے لیے تو آپ بھی جھک جائیں اس کے لیے‘‘

اگر مخالف فریق صلح پر آمادہ نظر آئے تو آپ ﷺ بھی امن کی خاطر مناسب شرائط پر اُن سے صلح کر لیں۔

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۱﴾ ’’اور اللہ پر توکّل کیجیے‘ یقیناً وہ سب کچھ سننے والا‘ جاننے والا ہے۔‘‘

یعنی آپؐ اُن کی منفی چالوں سے فکرمند نہ ہوں‘ اللہ پر توکّل رکھیں اور صلح کا جواب صلح سے ہی دیں۔

آیت ۶۲ ﴿وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ﴾ ’’اور اگر وہ ارادہ رکھتے ہوں آپؐ کو دھوکہ دینے کا‘ تب بھی (آپؐ گھبرائیے نہیں) آپؐ کے لیے اللہ کافی ہے۔‘‘

گویا ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت دی جا رہی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۲﴾ ’’اور وہی تو ہے (اللہ) جس نے

آپؐ کی مدد کی ہے اپنی نصرت سے اور اہلِ ایمان کے ذریعے سے۔‘‘

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی مدد اہلِ ایمان کے ذریعے سے کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے آپؐ کو ایسے مخلص اور جاں نثار صحابہ ؓ عطا کیے کہ جہاں آپؐ کا پسینہ گرا وہاں انہوں نے اپنے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس خصوصی امداد کی شان اس وقت خوب نکھر کر سامنے آتی ہے جب ہم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کے مقابلے میں حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھیوں کا طرزِ عمل دیکھتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ ؑ نے اپنی قوم کے لوگوں سے فرمایا کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلو‘ تو انہوں نے صاف کہہ دیا تھا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ (المائدۃ) ’’تو جائیے آپؑ اور آپؑ کا رب دونوں جا کر لڑیں‘ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں‘‘۔ جس پر حضرت موسیٰ ؑ نے بیزاری سے یہاں تک کہہ دیا تھا: ﴿رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۵﴾ ’’اے میرے رب! میں تو اپنی جان اور اپنے بھائی کے علاوہ کسی پر کوئی اختیار نہیں رکھتا‘ لہٰذا آپ ہمارے اور اس فاسق قوم کے درمیان علیحدگی کر دیں۔‘‘

ایک طرف یہ طرزِ عمل ہے جبکہ دوسری طرف نبی اکرم ﷺ کے صحابہ ؓ کا اندازِ اخلاص اور جذبہ جاں نثاری ہے۔ غزوۂ بدر سے پہلے جب حضور ﷺ نے مقامِ صفراء پر صحابہؓ سے مشاورت کی (اور یہ بڑی کانٹے دار مشاورت تھی) تو کچھ لوگ مسلسل زور دے رہے تھے کہ ہمیں قافلے کی طرف چلنا چاہیے اور وہ اپنے اس موقف کے حق میں بڑی زوردار دلیلیں دے رہے تھے‘ مگر حضور ﷺ ہر بار فرما دیتے کہ کچھ اور لوگ بھی مشورہ دیں! اس پر مہاجرین میں سے حضرت مقداد ؓ نے کھڑے ہو کر یہی بات کی تھی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلئے‘ آپ ہمیں حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح نہ سمجھئے‘ جنہوں نے کہہ دیا تھا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾۔ ہم آپؐ کے ساتھی ہیں‘ آپؐ جو حکم دیں ہم حاضر ہیں۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر ؓ نے بھی اظہارِ خیال فرمایا‘ لیکن حضور ﷺ انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصار نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مدینہ پر حملہ ہوا تو ہم آپؐ کی حفاظت کریں گے‘ لیکن یہاں معاملہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا تھا‘ لہٰذا جنگ کا فیصلہ انصار کی رائے معلوم کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حضرت سعد بن معاذ ؓ نے آپ ﷺ کی منشا

کو بھانپ لیا' لہٰذا وہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ شاید آپؐ کا روئے سخن ہماری (انصار کی) طرف ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں! اس پر انہوں نے کہا: لَقَدْ اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ ..... ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے ہیں' ہم آپؐ کو اللہ کا رسول مان چکے ہیں اور آپؐ سے سمع وطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں' اب ہمارے پاس آپؐ کے حکم کی تعمیل کے علاوہ کوئی راستہ (option) نہیں ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' اگر آپ اپنی سواری اس سمندر میں ڈال دیں گے تو ہم بھی آپ کے پیچھے اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اور خدا کی قسم' اگر آپؐ ہمیں کہیں گے تو ہم برک الغماد (یمن کا شہر) تک جا پہنچیں گے' چاہے اس میں ہماری اونٹنیاں لاغر ہو جائیں۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپؐ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا ٹکرائیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے' مقابلہ میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے' اور بعید نہیں کہ اللہ آپؐ کو ہم سے وہ کچھ دکھوا دے جسے دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپؐ ہمیں لے چلیں! حضرت سعدؓ کی اس تقریر کے بعد حضور ﷺ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور آپؐ نے بدر کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ یہ ایک جھلک ہے اس مدد کی جو اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کے انتہائی سچے اور مخلص صحابہؓ کی صورت میں حضور ﷺ کے شامل حال تھی۔

آیت ۶۳ ﴿وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''اور ان (اہلِ ایمان) کے دلوں میں اُس نے الفت پیدا کر دی۔ اگر آپؐ زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے تو اِن کے دلوں میں یہ اُلفت پیدا نہیں کر سکتے تھے''

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ''لیکن یہ تو اللہ نے اُن کے مابین (ایسی) الفت پیدا کر دی۔''

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۳ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فضل خاص کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ﴾ ''اور اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن تھے' پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی تو اس کی نعمت سے تم بھائی بھائی بن گئے' اور تم لوگ تو آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے جہاں سے اللہ نے تمہیں بچایا ہے۔''

﴿اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۶۳﴾ ''یقیناً وہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

آیت ۶۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۴﴾ ''اے نبی (ﷺ) آپ کے لیے کافی ہے اللہ اور وہ جو پیروی کر رہے ہیں آپ کی اہل ایمان میں سے۔''

اگر اس آیت کو پچھلی آیت کے ساتھ تسلسل سے پڑھا جائے تو اس کا ترجمہ یہی ہو گا جو اوپر کیا گیا ہے' لیکن اس کا دوسرا ترجمہ یوں ہو گا: ''اے نبی (ﷺ) اللہ کافی ہے آپ کے لیے بھی اور جو آپ کی پیروی کرنے والے مسلمان ہیں اُن کے لیے بھی''۔ عبارت کا انداز ایسا ہے کہ اس میں یہ دونوں مفاہیم آ گئے ہیں۔

آیت ۶۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ﴾ ''اے نبی (ﷺ) ترغیب دلایئے اہلِ ایمان کو قتال کی۔''

ہجرت کے بعد ۹ سال تک قتال کے لیے ترغیب' تشویق اور تحریص کے ذریعے ہی زور دیا گیا۔ یہ تحریص گاڑھی ہو کر ''تحریض'' بن گئی۔ اس دور میں مجاہدین کی فضیلت بیان کی گئی' اِن سے بلند درجات کا وعدہ کیا گیا (النساء: ۹۵) مگر قتال کو ہر ایک کے لیے فرضِ عین قرار نہیں دیا گیا۔ لیکن ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک کے موقع پر جہاد کے لیے نکلنا تمام اہلِ ایمان پر فرض کر دیا گیا۔ اس وقت تمام اہل ایمان کے لیے نفیر عام تھی اور کسی کو بلا عذر پیچھے رہنے کی اجازت نہیں تھی۔

﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ﴾ ''اگر تم میں سے بیس افراد ہوں گے صبر کرنے والے (ثابت قدم) تو وہ دو سو افراد پر غالب آ جائیں گے''

﴿وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اور اگر ہوں گے تم میں سے سو افراد تو وہ غالب آ جائیں گے کفار کے ایک ہزار افراد پر''

﴿بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵﴾ ''یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔''

یہاں سمجھ نہ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے موقف کی سچائی کا یقین نہیں ہے۔ ایک طرف وہ شخص ہے جسے اپنے نظریے اور موقف کی حقانیت پر پختہ یقین ہے' اس کا ایمان ہے کہ وہ حق پر ہے اور حق کے لیے لڑ رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے مقابلے میں وہ شخص ہے جو نظریاتی طور پر ڈانواں ڈول ہے' کسی کا تنخواہ یافتہ ہے یا کسی کے حکم پر مجبور ہو کر لڑ رہا ہے۔ اب ان دونوں اشخاص کی کارکردگی میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ چنانچہ کفار کو جنگ میں ثابت قدمی اور استقلال کی وہ کیفیت حاصل ہو ہی نہیں سکتی جو نظریے کی سچائی پر جان قربان کرنے

کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں اطراف کے افراد کی نظریاتی کیفیت کے اسی فرق کی بنیاد پر کفار کے ایک سو افراد پر دس مسلمانوں کو کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے۔ اس کے بعد والی آیت اگرچہ زمانی لحاظ سے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی مگر مضمون کے تسلسل کے باعث یہاں شامل کر دی گئی ہے۔

آیت ۶۶ ﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ﴾ ''اب اللہ نے تم پر سے تخفیف کر دی ہے اور اللہ کے علم میں ہے کہ تمہارے اندر کچھ کمزوری آ گئی ہے۔''

یہ کس کمزوری کا ذکر ہے اور یہ کمزوری کیسے آئی؟ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جہاں تک مہاجرین اور انصار میں سے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعلق ہے جو سابقون الاوّلون میں سے تھے تو ان کے اندر (معاذ اللہ) کسی قسم کی بھی کوئی کمزوری نہیں تھی' لیکن جو لوگ نئے مسلمان ہو رہے تھے ان کی تربیت ابھی اس انداز میں نہیں ہو پائی تھی جیسے پرانے لوگوں کی ہوئی تھی۔ ان کے دلوں میں ابھی ایمان پوری طرح راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں کی مجموعی تعداد میں ایسے نئے لوگوں کا تناسب روز بروز بڑھ رہا تھا۔ مثلاً اگر پہلے ہزار لوگوں میں پچاس یا سو نئے لوگ ہوں تو اب ان کی تعداد خاصی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ لہٰذا اوسط کے اعتبار سے مسلمانوں کی صفوں میں پہلے کی نسبت اب کمزوری آ گئی تھی۔

﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ﴾ ''پس اگر تم میں ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے''

﴿وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور اگر تم میں ایک ہزار ہوں گے تو وہ دو ہزار پر غالب آ جائیں گے اللہ کے حکم سے۔''

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۶۶﴾ ''اور یقیناً اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے۔''

آیات ۶۷ تا ۷۱

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ
تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۶۷
لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۶۸

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۹
يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ
قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝۷۰ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ
مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

آیت ۶۷ ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ وہ (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں خوب خونریزی نہ کر دے۔''

یہ آیت غزوۂ بدر میں پکڑے جانے والے قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ غزوۂ بدر میں قریش کے ستّر لوگ قیدی بنے۔ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے مشاورت کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ نرمی کی جائے اور فدیہ وغیرہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ خود حضور ﷺ چونکہ رؤف و رحیم اور رقیق القلب تھے اس لیے آپؐ کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس اعتبار سے بہت سخت گیر تھے (اَشَدُّ هُمْ فِی اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ)۔ آپؓ کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ آزاد ہو کر پھر کفر کے لیے تقویت کا باعث بنیں گے' اس لیے جب تک کفر کی کمر پوری طرح ٹوٹ نہیں جاتی ان کے ساتھ نرمی نہ کی جائے۔ آپؓ کا اصرار تھا کہ تمام قیدیوں کو قتل کر دیا جائے' بلکہ مہاجرین اپنے قریب ترین عزیزوں کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کریں۔ بعد میں ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ ہوا اور اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ اس فیصلے پر اس آیت کے ذریعے گرفت ہوئی کہ جب تک باطل کی کمر پوری طرح سے توڑ نہ دی جائے اُس وقت تک حملہ آور کفار کو جنگی قیدی بنانا درست نہیں۔ انہیں قیدی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زندہ رہیں گے' اور آج نہیں تو کل انہیں چھوڑنا ہی پڑے گا۔ لہٰذا وہ پھر سے باطل کی طاقت کا سبب بنیں گے اور پھر سے تمہارے خلاف لڑیں گے۔

﴿تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ﴾ ''تم دنیا کا ساز و سامان چاہتے ہو''

یہ فدیے کی طرف اشارہ ہے۔ اب نہ تو رسول اللہ ﷺ کی یہ نیت ہو سکتی تھی (معاذ اللہ) اور نہ ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی' لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسا ہے کہ اُس کے ہاں جب اپنے

مقرب بندوں کی گرفت ہوتی ہے تو الفاظ بظاہر بہت سخت استعمال کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان الفاظ میں بھی ایک طرح کی سختی موجود ہے' لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات نہ حضور ﷺ کے لیے ہے اور نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے۔

﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۶۷﴾ ''اور اللہ کے پیش نظر آخرت ہے۔ اور اللہ زبردست' حکمت والا ہے۔''

آیت ۶۸ ﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۶۸﴾ ''اگر اللہ کی طرف سے بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو جو کچھ (فدیہ وغیرہ) تم نے لیا ہے اس کے باعث تم پر بڑا سخت عذاب آتا۔''

اس سے مراد سورۂ محمدؐ کا وہ حکم ہے (آیت ۴) جو بہت پہلے نازل ہو چکا تھا۔ اس کی تفصیل ہم ان شاء اللہ سورۂ محمدؐ کے مطالعے کے دوران پڑھیں گے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حکم کی تعبیر (interpretation) میں کس طرح فدیہ لینے کی گنجائش نکالی تھی۔ یہ دراصل قانون کی تشریح و تعبیر کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ سورۃ الزمر کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہے: ﴿الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ﴾ یعنی وہ لوگ جو کسی بات کو سن کر پیروی کرتے ہیں اُس میں سے بہترین کی اور اس کے اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون کی تعبیر میں بھی ایسے ہی ہوا۔ چونکہ مذکورہ حکم کے اندر یہ گنجائش یا رعایت موجود تھی اس لیے حضور ﷺ نے اپنی طبیعت کی نرمی کے سبب اس کو اختیار فرما لیا۔ آیت زیر نظر کے اندر سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ سورۂ محمدؐ میں نازل شدہ حکم میں رعایت کی یہ گنجائش موجود تھی' اسی لیے تو اس حکم کا حوالہ دے کر فرمایا گیا کہ اگر وہ حکم پہلے نازل نہ ہو چکا ہوتا تو جو بھی تم نے فدیہ وغیرہ لیا ہے اس کے باعث تم پر بڑا عذاب آتا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کے نزول کے بعد روتے رہے ہیں۔ بہر حال اس فیصلے میں کسی صریح حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی اور جو بھی رائے اختیار کی گئی تھی وہ اجتہادی تھی اور آپ ﷺ نے اجتہاد کے ذریعے اس حکم میں سے نرمی اور رعایت کا ایک پہلو اختیار کر لیا تھا۔

آیت ۶۹ ﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠﴾ ''تو اب کھاؤ جو کچھ تمہیں ملا ہے غنیمت میں سے (کہ وہ تمہارے لیے) حلال اور طیّب (ہے)''

ایک مالِ غنیمت تو وہ تھا جو مسلمانوں کو عین حالت جنگ میں ملا تھا' اور دوسرے اس مال

کو بھی غنیمت قرار دے کر بلا کراہت حلال اور جائز قرار دے دیا گیا جو قیدیوں سے بطور فدیہ حاصل کیا گیا تھا۔

﴿وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۹﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔''

آیت ۷۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ﴾ ''اے نبی (ﷺ) کہہ دیجیے اُن لوگوں سے جو آپ کے قبضے میں قیدی ہیں''

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے پس منظر کے طور پر غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں دو باتیں ذہن میں رکھیے۔ ایک تو ان قیدیوں میں بہت سے وہ لوگ بھی شامل تھے جو اپنی مرضی سے جنگ لڑنے نہیں آئے تھے۔ وہ اپنے سرداروں کے دباؤ یا بعض دوسری مصلحتوں کے تحت بادلِ نخواستہ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ دوسری اہم بات اُن کے بارے میں یہ تھی کہ ان میں سے بہت سے لوگ بعض مسلمانوں کے بہت قریبی رشتہ دار تھے۔ خود نبی اکرم ﷺ کے حقیقی چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب بھی ان قیدیوں میں شامل تھے۔ ان کے بارے میں گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ ایمان تو لا چکے تھے مگر اس وقت تک انہوں نے اپنے ایمان کا اعلان نہیں کیا تھا۔ روایات میں ہے کہ حضرت عباسؓ جن رسیوں میں بندھے ہوئے تھے اُن کے بند بہت سخت تھے۔ وہ تکلیف کے باعث بار بار کراہتے تو حضور ﷺ اُن کی آواز سن کر بے چین ہو جاتے تھے' مگر قانون تو قانون ہے' لہٰذا آپ ﷺ نے اُن کے لیے کسی رعایت کی خواہش کا اظہار نہیں فرمایا۔ مگر جب اُن کی تکلیف طبیعت پر زیادہ گراں گزری تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ تمام قیدیوں کے بند ڈھیلے کر دیے جائیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کے داماد ابوالعاص بھی قید ہو کر آئے تھے اور جب آپؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کو چھڑانے کے لیے اپنا ہار فدیے کے طور پر بھیجا' جو اُنؓ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کی شادی کے موقع پر دیا تھا تو حضور ﷺ کے لیے بڑی رقت آمیز صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ آپ ﷺ نے جب وہ ہار دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گزاری ہوئی ساری زندگی' آپؐ کی خدمت گزاری اور وفاشعاری کی یاد مجسم ہو کر نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ اگر اجازت دیں تو یہ ہار واپس کر دیا جائے تاکہ ماں کی نشانی بیٹی کے پاس ہی رہے۔ چنانچہ سب کی اجازت سے وہ ہار واپس بھجوا دیا گیا۔ یوں قیدیوں کے ساتھ اکثر

مہاجرین کے خونی رشتے تھے‘ اس لیے کہ یہ سب لوگ ایک ہی خاندان اور ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

یہاں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ آپ کے قبضے میں جو قیدی ہیں آپ ان سے کہہ دیجیے:

﴿اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْکُمْ﴾ ’’اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لے لیا گیا ہے وہ اس سے بہتر تمہیں دے دے گا‘‘

یعنی تمہاری نیتوں کا معاملہ تمہارے اور اللہ کے مابین ہے‘ جبکہ برتاؤ تمہارے ساتھ خالصتاً قانون کے مطابق ہوگا۔ تم سب لوگ جنگ میں کفار کا ساتھ دینے کے لیے آئے تھے اور اب قانوناً جنگی قیدی ہو۔ جنگ میں کوئی اپنی خوشی سے آیا تھا یا مجبوراً‘ کوئی دل میں ایمان لے کر آیا تھا یا کفر کی حالت میں آیا تھا‘ ان سب باتوں کی حقیقت کو اللہ خوب جانتا ہے اور وہ دلوں کی نیتوں کے مطابق ہی تم سب کے ساتھ معاملہ کرے گا اور جس کے دل میں خیر اور بھلائی پائے گا اس کو کہیں بہتر انداز میں وہ اس بھلائی کا صلہ دے گا۔

﴿وَیَغْفِرْ لَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۷۰﴾﴾ ’’اور تمہیں بخش دے گا‘ اور اللہ بخشنے والا‘ بہت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

آیت ۷۱ ﴿وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ﴾ ’’اور اگر یہ لوگ آپ (ﷺ) سے خیانت کرنا چاہیں تو اس سے پہلے یہ اللہ سے بھی خیانت کرتے رہے ہیں‘‘

﴿فَاَمْکَنَ مِنْھُمْ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۷۱﴾﴾ ’’تو اللہ نے اُن کو پکڑوا دیا۔ اور اللہ جاننے والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘

یعنی ان قیدیوں میں ایسے بھی ہوں گے جو آپ ﷺ سے جھوٹ بولیں گے‘ جھوٹے بہانے بنائیں گے‘ بے جا معذرتیں پیش کریں گے۔ تو اس نوعیت کی خیانتیں یہ اللہ سے بھی کرتے رہے ہیں اور ان کے ایسے ہی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے کہ اب یہ لوگ آپ ﷺ کے قابو میں ہیں۔

اب اگلی آیات گویا اس سورۂ مبارکہ کا ’’حاصل کلام‘‘ یعنی concluding آیات ہیں۔

آیات ۷۲ تا ۷۵

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَا لَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ ﴿۷۳﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا مَعَکُمْ فَاُولٰٓئِکَ مِنْکُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۷۵﴾

آیت ۷۲ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں‘ اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور اُن کی مدد کی‘ یہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔‘‘

اُس وقت تک مسلمان معاشرہ دو علیحدہ علیحدہ گروہوں میں منقسم تھا‘ ایک گروہ مہاجرین کا تھا اور دوسرا انصار کا۔ اگرچہ مہاجرین اور انصار کو بھائی بھائی بنایا جا چکا تھا‘ لیکن اس طرح کے تعلق سے پورا قبائلی نظام ایک دم تو تبدیل نہیں ہو جاتا۔ اُس وقت تک صورت حال یہ تھی کہ غزوۂ بدر سے پہلے جو آٹھ مہمات حضور ﷺ نے مختلف علاقوں میں بھیجیں ان میں آپؐ نے کسی انصاری صحابیؓ کو شریک نہیں فرمایا۔ انصار پہلی دفعہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ اس تاریخی

حقیقت کو مدِنظر رکھا جائے تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کے پہلے حصے میں مہاجرین کا ذکر ہجرت کے علاوہ جہاد کی تخصیص کے ساتھ کیوں ہوا ہے؟ یعنی انصارِ مدینہ تو جہاد میں بعد میں شامل ہوئے‘ ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد تک تو جہادی مہمات میں حصہ صرف مہاجرین ہی لیتے رہے تھے۔ یہاں انصار کی شان یہ بتائی گئی: ﴿وَّالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا﴾ کہ انہوں نے اپنے دلوں اور اپنے گھروں میں مہاجرین کے لیے جگہ پیدا کی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی۔

﴿وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ ’’اور وہ لوگ جو ایمان لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی‘ تمہارا (اب) اُن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں‘‘

﴿حَتّٰى يُهَاجِرُوْا﴾ ’’حتیٰ کہ وہ ہجرت کریں۔‘‘

سورۃ النساء میں (جو اس سورت کے بعد نازل ہوئی ہے) ہجرت نہ کرنے والوں کے بارے میں واضح حکم (آیات ۸۹‘۹۰) موجود ہے۔ وہاں انہیں منافقین اور کفار جیسے سلوک کا مستحق قرار دیا گیا ہے کہ انہیں پکڑو اور قتل کرو اِلّا یہ کہ اُن کا تعلق کسی ایسے قبیلے سے ہو جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو۔

آیت زیرنظر میں بھی واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی اُن کے ساتھ تمہارا کوئی رشتۂ ولایت و رفاقت نہیں ہے۔ یعنی ایمانِ حقیقی تو دل کا معاملہ ہے جس کی کیفیت صرف اللہ جانتا ہے‘ لیکن قانونی تقاضوں کے لیے ایمان کا ظاہری معیار ہجرت قرار پایا۔ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد مکہ سے مدینہ ہجرت کی‘ انہوں نے اپنے ایمان کا ظاہری ثبوت فراہم کر دیا‘ اور جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی مگر ایمان کے دعویدار رہے‘ انہیں قانونی طور پر مسلمان تسلیم نہیں کیا گیا۔ مثلاً بدر کے قیدیوں میں سے کوئی شخص اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں تو ایمان لا چکا تھا‘ جنگ میں تو مجبوراً شامل ہوا تھا‘ تو اس کا جواب اس اصول کے مطابق یہی ہے کہ چونکہ تم نے ہجرت نہیں کی‘ لہٰذا تمہارا شمار ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ مل کر تم جنگ کرنے آئے تھے۔ اس لحاظ سے اس آیت کا روئے سخن بھی اسیرانِ بدر کی طرف ہے۔

ان میں سے اگر کوئی شخص اسلام کا دعویدار ہے تو وہ قانون کے مطابق فدیہ دے کر آزاد ہو‘ واپس مکہ جائے‘ پھر وہاں سے باقاعدہ ہجرت کر کے مدینہ آ جائے تو اسے صاحبِ ایمان تسلیم کیا جائے گا۔ پھر وہ تمہارا حمایتی ہے اور تم اس کے حمایتی ہو گے۔

﴿وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ﴾ ’’اور اگر وہ تم سے دین کے معاملے میں مدد مانگیں تو اُن کی مدد کرنا تم پر واجب ہے‘‘

یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے لیکن مکہ میں ہی رہے یا اپنے اپنے قبیلے میں رہے اور اُن لوگوں نے ہجرت نہیں کی‘ اگر وہ دین کے معاملے میں تم لوگوں سے مدد مانگیں تو تم ان کی مدد کرو۔

﴿اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ ’’مگر کسی ایسی قوم کے خلاف (نہیں) کہ اُن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو۔‘‘

اگرچہ دارالاسلام والوں پر ان مسلمانوں کی حمایت و مدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے جنہوں نے دارالکفر سے ہجرت نہیں کی ہے‘ تاہم وہ دینی اخوت کے رشتہ سے خارج نہیں ہیں۔ چنانچہ اگر وہ اپنے مسلمان بھائیوں سے اس دینی تعلق کی بنا پر مدد کے طالب ہوں تو ان کی مدد کرنا ضروری ہے‘ بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسے قبیلے کے مقابلے میں نہ مانگی جا رہی ہو جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ معاہدہ کا احترام بہرحال مقدم ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۷۲﴾ ’’اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔‘‘

آیت ۷۳ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ ’’اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔‘‘

عرب کے قبائلی معاشرے میں باہمی معاہدوں اور ولایت کا معاملہ بہت اہم ہوتا تھا۔ ایسے معاہدوں کی تمام ذمہ داریوں کو بڑی سنجیدگی سے نبھایا جاتا تھا۔ مثلاً اگر کسی شخص پر کسی قسم کا تاوان پڑ جاتا تھا تو اس کے ولی اور حلیف اس کے تاوان کی رقم پوری کرنے کے لیے پوری ذمہ داری سے اپنا اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ ولایت کی اہمیت کے پیش نظر اس کی شرائط اور حدود واضح طور پر بتا دی گئیں کہ کفار باہم ایک دوسرے کے حلیف ہیں‘ جب کہ اہلِ ایمان کا رشتۂ ولایت آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہے۔ لیکن وہ مسلمان جنہوں نے ہجرت نہیں کی‘ اُن کا اہلِ ایمان کے ساتھ ولایت کا کوئی رشتہ نہیں۔ البتہ اگر ایسے مسلمان مدد کے طلب گار ہوں تو اہلِ ایمان ضرور اُن کی مدد کریں‘ بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسے قبیلے کے خلاف نہ ہو جن کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے۔

﴿اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ﴾ ''اگر تم یہ (اِن قواعد و ضوابط کی پابندی) نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ پھیلے گا اور بہت بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔''

تم لوگوں کا ہر کام قواعد وضوابط کے مطابق ہونا چاہیے۔ فرض کریں کہ مکہ میں ایک مسلمان ہے' وہ مدینہ کے مسلمانوں کو خط لکھتا ہے کہ مجھے یہاں سخت اذیت پہنچائی جا رہی ہے' آپ لوگ میری مدد کریں۔ دوسری طرف اس کے قبیلے کا مسلمانوں کے ساتھ صلح اور امن کا معاہدہ ہے۔ اب یہ نہیں ہوسکتا کہ مسلمان اپنے اس بھائی کی مدد کے لیے اس کے قبیلے پر چڑھ دوڑیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قسم کی وعدہ خلافی اور ناانصافی کو پسند نہیں کرتا۔ اس مسلمان کو دوسرے تمام مسلمان کی طرح ہجرت کر کے دارالاسلام پہنچنا چاہیے اور اگر وہ ہجرت نہیں کر سکتا تو پھر وہاں جیسے بھی حالات ہوں اسے چاہیے کہ انہیں برداشت کرے۔ چنانچہ واضح انداز میں فرمایا دیا گیا کہ اگر تم ان معاملات میں قوانین وضوابط کی پاسداری نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا۔ اب وہ آیت آ رہی ہے جس کا ذکر سورہ کے آغاز میں پرکار (compass) کی تشبیہہ کے حوالے سے ہوا تھا۔

آیت ۷۴ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا﴾ ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (یعنی مہاجرین) اور وہ لوگ (انصارِ مدینہ) جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ ''یہی لوگ ہیں سچے مؤمن۔ اُن کے لیے ہے مغفرت اور رزقِ کریم۔''

یہاں پر مہاجرین اور انصار کے ان دونوں گروہوں کا اکٹھے ذکر کر کے ان مؤمنین صادقین کی خصوصیات کے حوالے سے ایک حقیقی مؤمن کی تعریف (definition) کے دوسرے رُخ کی جھلک دکھائی گئی ہے' جبکہ اس کے پہلے حصے یا رُخ کے بارے میں ہم اسی سورت کی آیت ۲ اور ۳ میں پڑھ آئے ہیں۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پہلے مذکورہ آیات کے مضمون کو ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ.....)' یعنی کلمۂ شہادت' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ۔ یہ پانچ ارکان مسلمان ہونے کے لیے

ضروری ہیں' لیکن حقیقی مؤمن ہونے کے لیے ان میں دو چیزوں کا مزید اضافہ ہوگا' جن کا ذکر ہمیں سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ملتا ہے: ''یقین قلبی'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ''۔ یعنی ایمان میں زبان کی شہادت کے ساتھ ''یقین قلبی'' کا اضافہ ہوگا اور اعمال میں نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے ساتھ ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا۔ گویا یہ سات چیزیں یا سات شرطیں پوری ہوں گی تو ایک شخص بندۂ مؤمن کہلائے گا۔ اس بندۂ مؤمن کی شخصیت کا جو نقشہ اس سورت کی آیت ۲ اور ۳ میں دیا گیا ہے اس کے مطابق اس کے دل میں یقین والا ایمان ہے' اللہ کی یاد سے اُس کا دل لرز اُٹھتا ہے' آیات قرآنی پڑھتا ہے یا سنتا ہے تو دل میں ایمان بڑھ جاتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ رکھتا ہے' نماز قائم کرتا ہے' زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اِن خصوصیات کے ساتھ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ﴾ کی مہر لگا دی گئی اور اس مہر کے ساتھ وہاں پر (آیت ۴) مؤمن کی شخصیت کا ایک رُخ یا ایک صفحہ مکمل ہو گیا۔

اب بندۂ مؤمن کی شخصیت کا دوسرا صفحہ یا رُخ آیت زیر نظر میں یوں بیان ہوا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ لازمی شرط کے طور پر اس میں شامل کر دیا گیا اور پھر اس پر بھی وہی مہر ثبت کی گئی ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ﴾ چنانچہ یہ دونوں رُخ مل کر بندۂ مؤمن کی تصویر مکمل ہو گئی۔ ایک شخصیت کی تصویر کے یہ دو رخ ایسے ہیں جن کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دو صفحے ہیں جن سے مل کر ایک ورق بنتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں کے اندر یہ دونوں رخ ایک ساتھ پائے جاتے تھے' مگر جیسے جیسے اُمت زوال پذیر ہوئی' بندۂ مؤمن کی شخصیت کی خصوصیات کے بھی حصے بخرے کر دیے گئے۔ بقولِ علامہ اقبالؔ: ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

آج مسلمانوں کی مجموعی حالت یہ ہے کہ اگر کچھ حلقے ذکر کے لیے مخصوص ہیں تو اُن کو جہاد اور فلسفۂ جہاد سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسری طرف جہادی تحریکیں ہیں تو اُن کو رُوحانی کیفیات سے شناسائی نہیں۔ لہٰذا آج اُمت کے دکھوں کے مداوا کرنے کے لیے ایسے اہلِ ایمان کی ضرورت ہے جن کی شخصیات میں یہ دونوں رنگ اکٹھے ایک ساتھ جلوہ گر ہوں۔ جب تک مؤمنین صادقین کی ایسی شخصیات وجود میں نہیں آئیں گی' جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح دونوں پہلوؤں میں توازن ہو' اس وقت تک مسلمان اُمت کی بگڑی تقدیر نہیں سنور سکتی۔

اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی کیفیات کا پیدا ہونا تو آج ناممکنات میں سے ہے‘ لیکن کسی نہ کسی حد تک اُن ہستیوں کا عکس اپنی شخصیات میں پیدا کرنے اور ایک ہی شخصیت کے اندر ان دونوں خصوصیات کا کچھ نہ کچھ توازن پیدا کرنے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ان میں سے ایک کیفیت ایک شخصیت کے اندر ۲۵ فیصد ہو اور دوسری کیفیت بھی ۲۵ فیصد کے لگ بھگ ہو تو قابلِ قبول ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ روحانی کیفیت تو ۷۰ فیصد ہو مگر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ صفر ہے یا جہاد کا جذبہ تو ۸۰ فیصد ہے مگر روحانیت کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی تو ایسی شخصیت نظریاتی لحاظ سے غیر متوازن ہوگی۔ بہرحال ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت کی تکمیل کے لیے یہ دونوں رُخ ناگزیر ہیں۔ اِن کو اکٹھا کرنے اور ایک شخصیت میں توازن کے ساتھ جمع کرنے کی آج کے دور میں سخت ضرورت ہے۔

آیت ۷۵ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ﴾ ’’اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا‘ تو (اے مسلمانو!) وہ تم میں سے ہی ہیں۔‘‘

وہ تمہاری جماعت‘ اسی اُمت اور حزب اللہ کا حصہ ہیں۔

﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’اور رحمی رشتے دار اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔‘‘

یعنی شریعت کے قوانین میں خون کے رشتے مقدّم رکھے گئے ہیں۔ مثلاً وراثت کا قانون خون کے رشتوں کو بنیاد بنا کر ترتیب دیا گیا ہے۔ اسی طرح شریعت کے تمام قواعد وضوابط میں رحمی رشتوں کی اپنی ایک ترجیحی حیثیت ہے۔ خونی رشتوں کی ان قانونی ترجیحات کو بھائی چارے اور ولایت کے تعلقات کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جائے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷۵﴾ ’’یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔‘‘

[تمّت سورۃ الانفال]

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم‘ ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

تفکّر ـ معرفتِ حق کا اہم ذریعہ

عتیق الرحمٰن صدیقی

نطق و گویائی کا وصف

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطق و گویائی کا وصف عطا کر کے اُسے حیوانات سے ممیّز کیا' مگر صرف قوتِ گویائی ہی اس کے مجد و شرف کا باعث نہیں' بلکہ اس کے پیچھے متعدد ذہنی قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ عقل و شعور' فہم و ادراک اور تمیز و ارادہ اس کے ذی اختیار اور ذی شعور ہونے کی اہم علامات ہیں۔ وہ ربّ قدیر و رحیم کی ودیعت کردہ صلاحیتوں اور تدبّر و تفکّر سے کام لے کر ہی اکتشافات و ایجادات کر کے تمدن کو نکھارتا اور اس کے نشو و ارتقاء کا باعث بنتا ہے۔ اس کا تجسّس و تفحص' اس کی تلاش و جستجو اور فکرِ عمیق کائنات کے اَسرار و رموز کو منکشف کرتی ہے۔ خیر و شر کی تمیز اسے اوجِ ثریا تک پہنچاتی ہے اور پھر وہ یا تو جادۂ مستقیم پر گامزن رہتا ہے یا تاریکیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں لڑھک جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے انسان کو جابجا ہدایت کی ہے کہ وہ مَن کی دنیا میں ڈوب کر اپنا سراغ پائے اور کائنات کی نیرنگیوں پر سوچ بچار کر کے شانِ ربوبیت کی حقیقتوں کا شناسا بنے۔

تفکّر کا مفہوم

الفِکرۃ اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے اور تفکّر کے معنی نظر عقل کے مطابق اس قوت کو جولانی دینے کے ہیں۔ تفکّر فیہ کا لفظ صرف اس چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جس کا تصور دل (ذہن) میں حاصل ہو سکتا ہو' اس لیے مروی ہے: ''تفکّروا فی آلاء اللّٰہ ولا تفکّروا فی اللّٰہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں پر تو غور کیا کرو' لیکن اللہ کی ذات میں کبھی غور نہ کرو کہ وہ کیسی ہے۔ اس لیے کہ وہ صورت کے ساتھ متصف ہونے سے منزّہ ہے اور اس کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آ سکتا۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ

مُّسَمًّی ؕ﴾ (الروم:۸) ''کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے' حق کے ساتھ ایک مقررہ مدت کے لیے پیدا کیا ہے''۔ ﴿اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِہِمْ مِّنْ جِنَّۃٍ ؕ﴾ (الاعراف:۱۸۴) ''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو کسی طرح کا بھی جنون نہیں ہے''۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الروم) ''جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں''۔ ﴿کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی (قدرت کی) نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو''۔

کائنات کی رعنایاں اور تفکر

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات کتنی حسین و خوشنما بنائی' ہر سو اس کی قدرت کے عجائب و کمالات جلوہ فشاں ہیں۔ آسمانوں کی رفعتوں کا منظر کتنا دلکش و دلفریب ہے' زمین کی پستیاں کتنی فکر افروز ہیں' اونچے کوہسار فلک سے محوِ کلام دکھائی دیتے ہیں' دریاؤں کی آبشاریں تحیّر افزا نظاروں کی مانند ہیں۔ سمندر کا سکون اپنے عمیق ظرف کا مظہر ہے' شجر و حجر کا انداز اپنا ہے' پھولوں کی عنبر فشانی وجد آفریں ہے' پھلوں کی حلاوت کا لطف منفرد ہے' ہرے بھرے اور سرسبز و شاداب گلستان اور رنگ رنگ کے لہلہاتے کھیت بصارت کو کس قدر فرحت بخشتے ہیں۔ مہر و مہ کی روشنی اکتساب نور کا کتنا فیضان عطا کرتی ہے' سورج کی حرارت و تمازت سودمند ثمرات پر منتج ہوتی ہے' چاند کی ٹھنڈک دل کی ویرانیوں کو بہار آشنا کرتی ہے' ستاروں اور سیاروں کی جگمگاہٹ اپنا نور بکھیرتی ہے۔ پرندے نغمہ سنج ہو کر فضاؤں کو لطافتوں سے ہمکنار کرتے ہیں' بلبلوں کی ترنم ریزیوں سے سکینت کو غذا میسّر آتی ہے' طاؤس کا رنگ دیدنی ہوتا ہے۔ زمین بیش قیمت خزانے اگلتی ہے' نوعِ انسانی کو بوقلموں غذائیں میسّر آتی ہیں' زمین و آسمان کے درمیان چلنے والی ہوائیں زندگی کو تر و تازگی اور طمانیت سے رونق افروز کرتی ہیں' آسمان سے چھم چھم مینہ برستا ہے اور زمین کی سیرابی دلوں کو کشادگی سے سرفراز کرتی ہے' کائنات کے ذرّے ذرّے میں اس قادر و قیوم کی شان نمایاں ہوتی ہے۔ یہ رعنائیاں اور زیبائیاں سوچنے سمجھنے والوں کو ایسی عظیم تر ہستی کا پتا دیتی ہیں جو علم و حکمت اور قوت و قدرت میں سب سے بالاتر ہے۔ یہ سوچ بچار اور تفقہ بندگانِ خدا کو اللہ کی معرفت کے نور سے منور کرتا ہے' اس اعتبار سے فکر کی یہ جولانی اس ربّ جلیل و جمیل کی عبودیت کا اعزاز عطا کرتی ہے۔

تفکّر ۔قرآن کریم کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾ (آل عمران)

''آسمان وزمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! تُو نے یہ سب بے فائدہ نہیں بنایا۔تُو پاک ہے' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔''

معلوم ہوا کہ عقل والے کہلانے کا استحقاق وہی لوگ رکھتے ہیں جو اپنے ربّ کو پہچانیں اور ہر وقت اور ہر حال میں اس کو یاد کریں۔ان کی دوسری علامت یہ ہے کہ وہ آسمان وزمین کی تخلیق اور پیدائش میں تفکر کرتے ہیں۔ حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ حضرت شیخ سلیمان درانیؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ''گھر سے نکل کر جس جس چیز پر میری نظر پڑتی ہے' میں دیکھتا ہوں کہ اس میں اللہ کی ایک نعمت مجھ پر موجود ہے اور میرے لیے باعث عبرت ہے''۔حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے: ''ایک ساعت غور وفکر کرنا رات بھر کے قیام سے افضل ہے''۔حضرت فضیلؒ حضرت حسن بصریؒ ہی کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ''غور وفکر اور مراقبہ ایک ایسا آئینہ ہے جو تیرے سامنے تیری برائیاں بھلائیاں پیش کردے گا''۔حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں: ''غور وفکر ایک نور ہے جو تیرے دل پر اپنا ایک پَرتو ڈالے گا۔آپ بسا اوقات یہ شعر پڑھتے ؎

اِذَا الْمَرءُ كَانَتْ لَهٗ فِكْرَةٌ
فَفِیْ كُلِّ شَیْءٍ لَهٗ عِبْرَةٌ

''جس انسان کو باریک بینی اور سوچ کی عادت پڑ گئی' اسے ہر چیز میں ایک عبرت اور آیت نظر آتی ہے۔'' (ابن کثیر' جلد اول)

اکابر کے ارشادات

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر (جلد اول' ص ۵۹۱۔۵۹۲) میں اسی موضوع پر متعدد اکابر عظام کے ارشادات رقم کیے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا بولنا ذکر اللہ اور نصیحت ہو' اور اس کا چُپ رہنا غور وفکر ہو' اور اس کا دیکھنا عبرت اور تنبیہہ ہو۔

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے: اے ابن آدم' اے ضعیف انسان! جہاں کہیں تو ہو' اللہ سے ڈرتا رہ' دنیا میں عاجزی اور مسکینی کے ساتھ رہ' اپنا گھر مسجدوں کو بنالے' اپنی آنکھوں کو رونا سکھا' اپنے جسم کو صبر کی عادت سکھا' اپنے دل کو غور وفکر کرنے والا بنا۔کل کی روزی کی فکر آج نہ کر۔

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کھنڈرات پر جاتے اور کسی ٹوٹے پھوٹے دروازے پر کھڑے رہ کر نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں فرماتے: اے اُجڑے ہوئے گھر وتمہارے رہنے والے کہاں گئے؟ پھر خود فرماتے: سب زیر زمین چلے گئے' سب فنا کا جام پی چکے' صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہمیشہ کی مالک ہے۔

☆ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے: اللہ عزوجل کے ذکر میں زبان کا چلانا بہت اچھا ہے اور اللہ کی نعمتوں پر غور وفکر کرنا افضل عبادت ہے۔

☆ حضرت عامر بن قیسؒ فرماتے ہیں: میں نے بہت سے صحابہؓ سے سنا ہے کہ ایمان کی روشنی غور وفکر اور مراقبہ میں ہے۔

☆ حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں: جس قدر مراقبہ زیادہ ہوگا اسی قدر سمجھ بوجھ تیز ہوگی' اور جتنی سمجھ زیادہ ہوگی اتنا علم نصیب ہوگا' اور جس قدر علم زیادہ ہوگا نیک اعمال بڑھیں گے۔

☆ حضرت بشیر بن حارث حافیؒ کا فرمان ہے: اگر لوگ اللہ کی عظمت کا خیال کرتے (یعنی تفکر کرتے) تو ہرگز ان سے نافرمانیاں نہ ہوتیں۔

☆ لقمان حکیم کا مقولہ ہے: تنہائی کی گوشہ نشینی جس قدر زیادہ ہو اسی قدر غور وفکر اور دور اندیشی کی عادت زیادہ ہوتی ہے اور جس قدر یہ بڑھ جائے اسی قدر راستے انسان پر کھل جاتے ہیں جو اسے جنت میں پہنچادیں گے۔

فکر و تفکّر۔ معرفتِ حق کا ذریعہ

فکر و تفکر ایک زیرک اور فہیم انسان کا اعلیٰ وصف ہے۔ تخلیقاتِ عالم پر غور و فکر سے اللہ کی صحیح پہچان پیدا ہوتی ہے اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا ادراک پیدا ہوتا ہے۔ آیاتِ الٰہیہ کو دیکھنے کے باوجود دلِ بینا پیدا نہ کرنا اور دنیا کے ظاہری رنگ و روپ میں کھو جانا سخت نادانی اور کم فہمی ہے۔ ایسے بے بصیرت اور حقیقت ناآشنا لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ﴿۱۰۵﴾﴾ (یوسف)

''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ایسی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں۔''

صاحبِ تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''درخت کو درخت اور پہاڑ کو پہاڑ اور پانی کو پانی تو جانور بھی دیکھتا ہے اور اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے ہر جانور ان کا مصرف بھی جانتا ہے۔ مگر جس مقصد کے لیے انسان کو حواس کے ساتھ سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے، وہ صرف اس حد تک نہیں کہ آدمی ان چیزوں کو دیکھے اور ان کا مصرف اور استعمال معلوم کرے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی حقیقت کی جستجو کرے اور ان نشانیوں کے ذریعے سے اس کا سراغ لگائے۔ اسی معاملہ میں اکثر انسان غفلت برت رہے ہیں اور یہی غفلت ہے جس نے ان کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔'' (سورۂ یوسف حاشیہ ۷۵)

اگر زمین و آسمان کی نشانیوں کو سطحی نظر سے دیکھنے کے بجائے چشم بصیرت وا کر کے دیکھا جائے تو اصل حقائق واشگاف ہوتے ہیں اور خالق کون و مکان کی معرفت پیدا ہوتی ہے۔ اس معرفت کے لیے کوشاں رہنا ایک افضل عبادت بھی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ لکھتے ہیں کہ کائناتِ طبعی کے ان عظیم الشان موجودات کے قوانین طبعی اور قواعد تکوینی سے صانع اعظم و خالق عالم کی قدرت، حکمت، صنعت پر استدلال کرتے رہنا عبادت ہی نہیں ایک اعلیٰ و اشرف عبادت ہے۔ **هو افضل العبادات كما قال عليه الصلوٰة لا عبادة كالتفكر لانه المخصوص بالقلب والمقصود من خلق (بيضاوى) دلت الآية على ان اعلى مراتب الصديقين التفكر فى دلائل الذات والصفات** (تفسیر ماجدی، بحوالہ تفسیر کبیر)۔ گویا سورۂ آلِ عمران کی آیت کریمہ سے یہ دلیل لائے کہ اللہ کی ذات و صفات میں تفکّر صدیقین کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کرنے کا باعث بنتا ہے۔

تفکّر اور مقاماتِ قرآنیہ

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر تفکّر و تدبّر کی ترغیب دی اور اسے اللہ تک پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ بتایا۔ سورۂ سبا میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴿۴۶﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہو کہ میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ اللہ کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو کہ تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات جنون کی ہے؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے۔''

حضور نبی کریم ﷺ جو حقائق مشرکین کے سامنے رکھتے تھے انہوں نے ان کا مشاہدہ کیا ہوتا تھا، مگر وہ ان حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے انکاری ہوتے تھے۔ ان کے خیالات قیاس و گمان پر مبنی ہوتے تھے یا اندھی تقلید پر اور ان کے ہاں دل بینا کی طلب کا فقدان تھا۔ علامہ اقبال نے کہا۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نُور دل کا نُور نہیں!

وہ ارادتاً ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو جاتے تھے، حضور ﷺ اور ان میں فرق بینا اور نابینا ہونے کا تھا۔ اسی تناظر میں قرآن نے کہا: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ﴿۵۰﴾﴾ (الانعام) ''ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے''۔ ایک شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے اسے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا، مگر وہ خواہش نفس کی وجہ سے اس پابندی سے نکل بھاگا اور پھر اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی۔ قرآن نے کہا: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴿۱۷۶﴾﴾ (الاعراف) ''یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، پس تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو شاید یہ غور و فکر کریں۔''

دنیا کی چند روزہ عیش و طرب کی زندگی میں کھو جانے والوں کی مثال قرآن حکیم نے ان الفاظ میں دی ہے:

﴿اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ

الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ (یونس)

''دنیا کی زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار' جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں' خوب گھنی ہوگئی۔ پھر عین اس وقت جب زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آیا اور ہم نے اسے غارت کر کے رکھ دیا گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔''

سورۃ الغاشیہ میں فرمایا:

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ فَذَكِّرْ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾﴾

''تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟ اچھا تو (اے نبی ﷺ!) نصیحت کیے جاؤ' آپ تو بس نصیحت ہی کرنے والے ہیں۔''

سورۂ یوسف (آیت ۱۰۹) میں فرمایا:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ﴾

''پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ دیکھ لیتے ان قوموں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں!''

سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

''وہ اس پانی سے کھیتیاں اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل (پیدا کرتا ہے)۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

سورۃ الرعد میں پہلے آسمانوں کی ساخت اور شمس و قمر کا ذکر فرمایا' نظامِ فلکی کا تذکرہ کر کے خالق کی کمال درجہ حکمت کی بات کی اور پھر عالم ارضی کی طرف توجہ دلائی اور توحید و آخرت پر ان دونوں حقیقتوں سے استشہاد کیا۔ فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِىْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾﴾

''اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے اور اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اُسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔''

تفکّر اور حقائق کی معرفت

ف ک ر (فَکَرَ یَفْکِرُ فِکْرًا) کے مادے سے قرآن کریم میں تقریباً اٹھارہ مقامات پر اس کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں' ہم نے بعض کی تفصیلات بیان کر دی ہیں اور باقی کو طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا ہے۔ ان تمام مقامات پر غور و فکر کی ترغیب بھی ہے اور حکم بھی۔ اس سے مطلوب یہ ہے کہ کائنات کے مقصدِ تخلیق کو سمجھا جائے اور توحید' رسالت اور آخرت کی حقیقتوں کی معرفت حاصل کی جائے۔ اس معرفت کے نتیجے میں یہ اخذ کر لیا جائے کہ اللہ نے انسان کو ایک عظیم مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرے۔ نہ صرف اپنے تزکیہ و تصفیہ کے لیے کوشاں رہے بلکہ دوسروں کی اصلاح کے لیے بھی سرگرم عمل رہے تاکہ اس کی کاوش اور جدّ و جُہد کے نتیجے میں اللہ کا کلمہ بلند ہو اور دینِ حق غالب ہو کر رہے اور حضور نبی کریم ﷺ کا پیغام چار دانگِ عالم میں پھیل جائے۔ امام غزالیؒ نے حضرت عطا اور عبید بن عمر کی اس حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے گریہ و بُکا کو گریہ تشکّر اور آل عمران کے آخری رکوع کی آیات میں تفکر کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حضرت ابو یعلیٰ

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں' کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ)) (سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع)

''عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد آنے والی دنیا کے لیے عمل کرے' اور عاجز و درماندہ وہ ہے جو اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے اور اللہ کی مغفرت و رحمت کی تمنا کرے۔''

جولانی فکر کے میدان

انڈیا کے جید عالم سید احمد عروج قادری اپنی کتاب ''اسلامی تصوف'' میں رقمطراز ہیں:

''فکر کی جولانی کے لیے کوئی ایک ہی میدان نہیں ہے بلکہ یہ بے شمار میدانوں میں دوڑتی اور بے شمار علم حاصل کرتی ہے اور پھر ان سے اعمال کی شکل میں بے شمار ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔''

انہوں نے اس ضمن میں چند میدانوں کی فہرست دی ہے' ان میں ہر میدان ایک مستقل نوع ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں تفکّر (۲) اللہ کی صفات میں تفکّر (۳) معاصی میں تفکّر (۴) طاعات میں تفکّر (۵) مہلکات یعنی ہلاک کرنے والے گناہوں میں تفکّر (۶) منجیات یعنی نجات دینے والی نیکیوں میں تفکر۔

اگر ہمارے غور و فکر اور سوچ بچار کا محور یہ میدان ہوں تو یقیناً ہم اپنے رب کریم کا تقرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے' ہر حال میں ہماری نظر اپنے اعمال و افعال اور احوال پر ہوگی اور ہم معصیت میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہم ہر قسم کی اخلاقی رذالتوں سے محفوظ رہیں گے اور ہماری پسند و ناپسند کا پیمانہ وہی ہوگا جو اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ نے ہمارے لیے متعین کیا ہے۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حصولِ علم کی فرضیت‘ اہمیت اور فضیلت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یہ جہان دارالعمل ہے۔ یہاں ہر شخص کو کسی قدر اختیار ہے کہ وہ جیسا چاہے عمل کرے۔ عمل کی بنیاد علم ہے اور علم ہی کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا برا۔ اسی لیے حصولِ علم کو فرض قرار دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص اچھائی اور برائی سے واقف ہو اور پھر اپنے ارادے سے اچھے یا برے کام کا انتخاب کرے۔ اس دنیا میں زندگی گزار کر بندہ جب دارالجزا میں پہنچے گا تو اس سے اس کے اعمال کی باز پرس ہوگی اور اچھائی کی جزا اور برائی کی سزا کا فیصلہ ہوگا۔ پس حصولِ علم ضروری ہوا تاکہ انسان جائز اور ناجائز‘ حلال اور حرام‘ گناہ اور ثواب‘ خیر اور شر‘ حق اور باطل سے باخبر ہو سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (۱)

’’حصول علم ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔‘‘

اکثر اس حدیث میں كُلِّ مُسْلِمٍ کے بعد ’’وَمُسْلِمَةٍ‘‘ بھی لکھا ہوا دیکھا گیا ہے‘ جبکہ یہ لفظ حدیث میں نہیں ہے‘ البتہ معنوی طور پر مسلم کا لفظ مرد و عورت دونوں کو شامل ہے۔ یوں ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ ’’علم حاصل کرو ماں کی گود سے قبر میں جانے تک۔‘‘

علم روشنی کی مانند ہے۔ انسان کی دو آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتا ہے مگر تاریکی میں اور رات کے اندھیرے میں کھلی آنکھوں کے باوجود اسے نظر نہیں آتا۔ چیزوں کو دیکھنے کے لیے روشنی ضروری ہے‘ ورنہ انسان آنکھوں کے باوجود تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ یہی حال بے علم اور جاہل کا ہے کہ وہ اچھائی اور برائی سے ناواقف بہکا پھرتا ہے۔ ع ’’بے علم نتواں خدا

راشناخت‘‘ یعنی ’’بے علم آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا‘‘۔ معلوم ہوا کہ معرفتِ خداوندی کے لیے علم لازمی ہے —— علم وہ شمع ہے جس کی روشنی میں انسان راستے کی رکاوٹوں اور ناہمواریوں سے بچ کر چل سکتا ہے۔ فرشتے نورانی مخلوق ہیں‘ ان سے کوئی برائی سرزد نہیں ہوتی۔ وہ وہی کام کرتے ہیں جس کا انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح وہ معصوم عن الخطا مخلوق ہیں‘ مگر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے بجائے انسان کو اشرف المخلوق بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدمؑ کو پیدا کیا تو اسے مسجودِ ملائکہ کا درجہ دیا۔ یہ اس لیے کہ جب فرشتوں سے چند چیزوں کے نام پوچھے گئے تو انہوں نے بے بسی کا اظہار کیا اور وہ نام نہ بتا سکے۔ پھر اللہ نے ان چیزوں کے نام آدمؑ سے پوچھے تو انہوں نے بتا دیئے۔ اس طرح آدمؑ کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

جو پایہ علم سے پایا بشر نے
فرشتوں نے بھی وہ پایہ نہ پایا

اب انسان کی فضیلت اس بات میں ہے کہ وہ علم حاصل کر کے خوب وزشت سے واقف ہو اور اچھائی کے کام کرے اور برائیوں سے دور رہے۔ سلطان العارفین سلطان باہوؒ نے صحیح فرمایا ہے: ’’باہجوں علم جے کریں فقیری کافر مریں دیوانہ ہو‘‘ یعنی علم کے بغیر انسان کو بلند مراتب نہیں مل سکتے اور اگر کوئی علم کے بغیر فقیری یعنی کمال کا دعویٰ کرے تو وہ اس میں جھوٹا ہے بلکہ علم سے تہی دست ہونا تو دیوانگی ہے جو اس کا خاتمہ کفر پر کر دے گی۔ اسی بات کو ولی کامل علی ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ’’جاہل درویش اسلام کے دشمن ہیں‘‘۔ درویش تو خدا پرست اور لذائذ دنیا سے نفور ہوتا ہے‘ مگر جو شخص درویشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو اور اپنی ہیئت اور حرکات و سکنات سے درویشی کا دعویٰ کرتا ہو مگر علم سے بے بہرہ ہو تو وہ اسلام کو بدنام کرنے کا باعث ہے۔ درویش تو وہ ہے جس کو شرع محمدیؐ کا علم حاصل ہو اور وہ اس کی حدود و قیود کا لحاظ رکھتے ہوئے زندگی گزارے۔ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ گویا تقویٰ اختیار کیے بغیر درویشی کا دعویٰ ہی غلط ہے۔

علم دو قسم کا ہے‘ ایک دین کا علم اور دوسرا دُنیوی علم۔ انسان کی اصل فضیلت علم دین میں منحصر ہے‘ جبکہ دنیوی علوم کی یہ فضیلت نہیں۔ وہ انسان کی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں۔ علومِ جدیدہ فزکس‘ کیمسٹری‘ اقتصادیات‘ سیاسیات‘ طب‘ انجینئرنگ اور دوسرے

بے شمار علوم روزی کمانے کے لیے ضروری ہیں' لیکن ان علوم کے حاصل کرنے میں اس قدر منہمک ہو جانا کہ علم دین کی اہمیت ذہن سے محو ہو جائے' یہ نری جہالت ہے۔ ایک اچھا وکیل' ڈاکٹر' انجینئر یا دکان دار اگر اپنے کام میں ماہر ہے' اپنے پیشے سے خوب دولت کما رہا ہے اور خوشحال زندگی گزار رہا ہے' مگر اس کی زندگی تقویٰ کے بغیر گزر رہی ہے تو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ یا اپنے فن میں ماہر ہونے کے باوجود جاہل ہے۔ اگر اس کو اپنی جہالت کا علم بھی نہیں ہے تو پھر وہ جہلِ مرکّب کا شکار ہے' اور اگر اسے اپنی جہالت کا علم ہے تو ہو سکتا ہے وہ کسی وقت اپنی اس جہالت کو ترک کر کے شرعِ محمدیؐ کے مطابق زندگی گزارنے کا عزم کر لے۔

بہترین علم تو قرآن مجید کا سیکھنا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))(۲) ''تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن مجید کا علم حاصل کرے اور پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دے''۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ یہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اس کلام کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر دیا ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک رکھا ہے۔ یہ کلام حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا' انہوں نے انسانوں کو اس کی تعلیم دی اور خود قرآن کی تعلیم کے مطابق عمل کر کے دکھایا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی منشائے الٰہی یعنی قرآنی تعلیمات کے مطابق گزر رہی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زندگی کو دوسرے تمام انسانوں کے لیے نمونۂ عمل قرار دیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''بے شک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے زندگی گزارنے کا خوبصورت نمونہ موجود ہے۔''

اسی علم کو حاصل کرنے اور پھر اس علم پر عمل کرنے میں ہی انسان کی فضیلت ہے۔

انسان کا مقصدِ تخلیق عبادتِ ربّ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے''۔ اب عبادت کرنے کا سلیقہ تو علم سے ہی آئے گا۔ اسی لیے علم کو عبادت پر فوقیت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِيْ مَسْجِدِهٖ فَقَالَ: ((كِلَاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ وَاَحَدُهُمَا اَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ' اَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَيَرْغَبُوْنَ اِلَيْهِ

فَاِنْ شَاءَ اَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ' وَاَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ اَوِ الْعِلْمَ وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ فَهُمْ اَفْضَلُ وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) قَالَ ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ(۳)

''رسول اللہ ﷺ کا گزر دو مجلسوں پر ہوا جو آپ کی مسجد میں قائم تھیں' آپ ﷺ نے فرمایا: ''دونوں مجلسیں خیر اور نیکی کی مبارک مجلسیں ہیں اور ان میں سے ایک مجلس دوسری سے زیادہ افضل ہے۔ (ایک مجلس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ) یہ لوگ اللہ سے دعا اور مناجات میں مشغول ہیں' اللہ چاہے تو عطا فرما دے اور چاہے تو عطا نہ فرمائے (وہ مالک مختار ہے) اور (دوسری مجلس کے بارے میں فرمایا کہ) یہ لوگ دین کا علم اور فہم حاصل کرنے میں اور نہ جاننے والوں کو سکھانے میں لگے ہوئے ہیں' لہٰذا ان کا درجہ بالاتر ہے اور میں تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر آپؐ اسی مجلس میں بیٹھ گئے۔''

رسول اللہ ﷺ کا ہر عمل منشائے خداوندی کے مطابق تھا۔ آپؐ نے کسی فردِ بشر کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ آپ اُمی تھے' مگر علومِ الٰہی کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس قدر کامل علم عطا فرمایا کہ آپؐ نے اس کی روشنی میں بھرپور زندگی گزاری اور پھر لوگوں کو بھی وہ علم سکھایا' کیونکہ لوگوں تک ہدایت کا پیغام پہنچانا آپؐ کا فرض منصبی تھا' جسے قرآن مجید میں ان الفاظ سے واضح کیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدۃ:۶۷)

''اے رسول! جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچائیے۔ اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا رسالت کا فریضہ ہی ادا نہ کیا۔''

آپؐ نے اس ذمہ داری کو انتہائی محنت اور جدّوجہد کے ساتھ ادا کیا اور لوگوں کو احکامِ الٰہی سے روشناس کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اس جدّوجہد کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

﴿طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲﴾ (طٰہٰ)

''طاہا۔ (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔''

یعنی فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں اتنی مشقت نہ اٹھائیے۔ آپؐ پر تو صرف لوگوں تک پیغامِ حق پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ان کو ہدایت کے راستہ پر ڈالنا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ پھر

سورۃ الکہف میں فرمایا:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶﴾

''(اے پیغمبر ﷺ!) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ نے انتہائی خیر خواہی اور دلسوزی کے ساتھ علم حقیقی لوگوں کو سکھایا۔ چونکہ یہ علم انسان کی نجات کے لیے ناگزیر ہے اس لیے آپؐ نے تمام انسانوں پر لازم کیا کہ وہ خود علم حاصل کریں اور پھر دوسروں کو سکھائیں۔ حضرت عبدالرحمٰن کے والد ابزی الخزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ فَاَثْنٰى عَلٰى طَوَائِفَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا، ثُمَّ قَالَ: ((مَا بَالُ اَقْوَامٍ لَا يُفَقِّهُوْنَ جِيْرَانَهُمْ وَلَا يُعَلِّمُوْنَهُمْ وَلَا يَعِظُوْنَهُمْ وَلَا يَاْمُرُوْنَهُمْ وَلَا يَنْهَوْنَهُمْ! وَمَا بَالُ اَقْوَامٍ لَا يَتَعَلَّمُوْنَ مِنْ جِيْرَانِهِمْ وَلَا يَتَفَقَّهُوْنَ وَلَا يَتَّعِظُوْنَ! وَاللّٰهِ لَيُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِيْرَانَهُمْ وَيُفَقِّهُوْنَهُمْ وَيَعِظُوْنَهُمْ وَيَاْمُرُوْنَهُمْ وَيَنْهَوْنَهُمْ وَلَيَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِيْرَانِهِمْ وَيَتَفَقَّهُوْنَ وَيَتَّعِظُوْنَ اَوْلَاُعَاجِلَنَّهُمْ بِالْعُقُوْبَةِ فِيْ دَارِ الدُّنْيَا))(۴)

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے (مسجد میں منبر پر) خطاب فرمایا۔ پس آپ ﷺ نے مسلمانوں کے بعض گروہوں کی تعریف فرمائی (کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرتے ہیں) اس کے بعد آپ ﷺ نے (مسلمانوں کے بعض دوسرے گروہوں کو تنبیہ اور سرزنش کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''کیا حال ہے ان لوگوں کا (اور کیا عذر ہے ان کے پاس) جو اپنے پڑوس والے (ان مسلمانوں کو جو دین سے واقف نہیں ہیں) دین نہیں سمجھاتے اور دین کی تعلیم نہیں دیتے اور وعظ و نصیحت نہیں کرتے اور ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام نہیں دیتے! (اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے فرمایا) اور کیا حال ہے ان لوگوں کا (اور کیا عذر ہے ان کے پاس جو دین اور اس کے احکام سے واقف نہیں ہیں' اس کے باوجود) وہ اپنے پڑوس میں رہنے والے (ان مسلمانوں سے جو دین کی سمجھ بوجھ اور اس کا علم حاصل کر چکے ہیں) دین سیکھنے اور اس کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کی اور ان کے وعظ و نصیحت سے مستفید ہونے کی کوشش نہیں

کرتے! (اس کے بعد آپ ﷺ نے قسم کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ) وہ لوگ (جو دین کا علم رکھتے ہیں' علم نہ رکھنے والے) اپنے پڑوسیوں کو لازماً دین سکھانے اور دین کی سمجھ بوجھ ان میں پیدا کرنے کی کوشش کریں' اور ان کو وعظ و نصیحت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کریں..... اور (جو لوگ دین اور اس کے احکام سے واقف نہیں' ان کو) میری تاکید ہے کہ وہ (دین کی سمجھ بوجھ اور اس کا علم رکھنے والے) اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھیں اور اس کی سمجھ بوجھ حاصل کریں' اور ان کے وعظ و نصیحت سے استفادہ کیا کریں' ورنہ (یعنی اگر ان دونوں فریقوں نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا تو) میں ان کو اس دنیا ہی میں سزا دلواؤں گا۔''

گویا آپ ﷺ کی منشا یہ ہے کہ ہر آبادی میں دین کی عمومی تعلیم و تربیت کا ایسا نظام قائم ہو جس میں ہر شخص اپنی ذمہ داری محسوس کرے۔ جہاں نہ جاننے والوں پر لازم ہے کہ وہ دین کا علم ضرور حاصل کریں۔ وہاں اہلِ علم کو بھی اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو ضرور علم سکھائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے میں کسی بھی طرح کی کوتاہی کرنے کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ اکثر نماز روزہ کرنے والے اور اپنا وقت ذکر و اذکار اور تلاوت میں گزارنے والے اپنے عمل کو کافی سمجھ کر مطمئن ہیں اور اس فرض سے غافل ہیں کہ دین کے علم کے حصول میں لگنا عبادت سے زیادہ فضیلت والا کام ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے بطریق ارسال روایت کیا ہے کہ:

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِيْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اَحَدُهُمَا كَانَ عَالِمًا يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَالْآخَرُ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ الَّيْلَ اَيُّهُمَا اَفْضَلُ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((فَضْلُ هٰذَا الْعَالِمِ الَّذِيْ يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الَّذِيْ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ الَّيْلَ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ رَجُلًا)) (۵)

''رسول اللہ ﷺ سے بنی اسرائیل کے ایسے دو آدمیوں کے بارے میں دریافت کیا گیا جن میں سے ایک کا معمول یہ تھا کہ وہ فرض نماز پڑھتا' پھر بیٹھ کر لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی باتیں بتلاتا اور دین کی تعلیم دیتا —— اور دوسرے صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ دن کو برابر روزہ رکھتا اور رات کو کھڑے ہو کر نوافل پڑھتا (آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا)

کہ ان دونوں میں کون افضل اور اعلیٰ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ عالم جو فرض نماز ادا کرتا ہے پھر لوگوں کو دین اور نیکی کی باتیں سکھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے' اس کو اس صائم النہار اور قائم اللیل عابد کے مقابلہ میں اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ فرض نماز اور روزہ کی ادائیگی تو ضروری ہے' اس کے علاوہ نوافل کی بھی بڑی تاکید کی گئی ہے' مگر تعلیم و تعلّم کو نوافل پر اس درجہ فضیلت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں مجالس کو اچھا قرار دیا' مگر جہاں دین کی تعلیم ہو رہی تھی اس کو بہتر فرمایا اور آپؐ اس مجلس میں بیٹھ گئے —— اس کے بعد تعلیم و تعلّم کی اہمیت کو مزید واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ عالم کو عابد پر اتنی فضیلت ہے جتنی تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت ہے۔

تحصیل علم بڑی فضیلت کا کام ہے' اس لیے اس مقصد کے لیے سفر اختیار کرنے والے کی بھی رسول اللہ ﷺ نے توصیف فرمائی ہے اور اسے جنتیوں والا کام بتایا ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ بِهٖ عِلْمًا سَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ، وَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَاِنَّ الْعَالِمَ يَسْتَغْفِرُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالْحِيْتَانُ فِيْ جَوْفِ الْمَاءِ، وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، وَاِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَاِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ)) (۶)

''جو بندہ (دین کا) علم حاصل کرنے کے لیے کسی راستہ پر چلے گا' اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلائے گا —— اور (آپ ﷺ نے فرمایا کہ) اللہ کے فرشتے طالبانِ علم کے لیے اظہار رضا (اور اکرام و احترام) کے طور پر اپنے بازو جھکا دیتے ہیں اور (فرمایا کہ) علم دین کے حامل کے لیے آسمان و زمین کی ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی استدعا کرتی ہیں' یہاں تک کہ دریا کے پانی کے اندر رہنے والی مچھلیاں بھی —— اور (آپ ﷺ نے فرمایا کہ) عبادت گزاروں کے مقابلہ میں حاملین علم کو ایسی برتری حاصل ہے جیسی کہ چودھویں رات کے چاند کو آسمان کے باقی ستاروں پر —— اور (یہ بھی فرمایا کہ) علماء انبیاء کے وارث

ہیں' اور انبیاء علیہم السلام نے دیناروں اور درہموں کا ترکہ نہیں چھوڑا ہے' بلکہ انہوں نے اپنے ترکے اور ورثے میں صرف علم چھوڑا ہے' پس جس نے اس کو حاصل کر لیا اس نے بہت بڑی کامیابی اور خوش بختی حاصل کر لی۔''

گویا جب کوئی شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ جنت کی طرف جانے والا راستہ طے کر رہا ہوتا ہے —— حدیث کے آخری حصہ میں فرمایا کہ عام لوگوں کی طرح انبیاء کرام علیہم السلام اپنے پیچھے درہم و دینار نہیں چھوڑتے بلکہ وہ دین کا نورانی علم چھوڑ کر جاتے ہیں' اور جو لوگ اس علم کے حصول میں لگ جاتے ہیں وہی انبیاء کے وارث قرار پاتے ہیں اور انبیاء کا وارث ہونا خود بہت بڑی فضیلت ہے۔ طبرانی نے معجم الاوسط میں نقل کیا ہے کہ ایک دن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بازار کی طرف سے گزرے۔ لوگ کاروبار میں مشغول تھے۔ آپؓ نے ان سے فرمایا: ''تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے' تم یہاں ہو اور مسجد میں رسول اللہ ﷺ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے!'' یہ سن کر لوگ مسجد کی طرف چل پڑے۔ مسجد سے واپس آئے تو کہا: وہاں تو کچھ بھی نہیں بٹ رہا' بس لوگ بیٹھے نماز پڑھ رہے ہیں' کچھ تلاوت کر رہے ہیں اور کچھ لوگ حلال و حرام کی باتیں کر رہے ہیں' یعنی شرعی مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: ''یہی تو رسول اللہ ﷺ کی میراث ہے۔''

علمِ دین کی تحصیل میں محنت و مشقت اور سفر اختیار کرنا اعلیٰ درجے کا عمل ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ كَانَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ)) (۷)

''جو بندہ علم کے حصول کے لیے (گھر سے یا وطن سے) نکلا وہ اس وقت تک اللہ کے راستے میں ہے جب تک واپس نہ آ جائے۔''

علم حاصل کر کے اسے دوسروں تک پہنچانا اور بھی بڑا کام ہے اور اجر و ثواب کا باعث ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ وَاَهْلَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ)) (۸)

''اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے اور آسمان و زمین میں رہنے والی ساری مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اور (پانی میں رہنے والی) مچھلیاں بھی اس بندے کے لیے دعائے خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی اور دین کی تعلیم

دیتا ہے۔‘‘

گویا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی کُل مخلوق کو اور فرشتوں کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ جو لوگ تعلیم و تعلّم کا مبارک کام اختیار کریں وہ ان کے لیے دعائے خیر کرتے رہیں۔

اگرچہ دنیوی علوم سیکھنے بھی ضروری ہیں‘ کیونکہ معاشی جِدّوجُہد کے لیے ان کا حصول ناگزیر ہے‘ مگر علم دین کی تحصیل کے بغیر چارہ نہیں‘ کیونکہ اس کے بغیر بندہ نہ اللہ کی رضا جان سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ناراضگی والے کاموں سے بچ سکتا ہے۔ بڑے مبارک ہیں وہ لوگ جو دُنیوی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت کی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور اس علم کی روشنی میں خود نیکی کے کام کرتے اور برائی سے رکتے ہیں‘ نیز وہ دوسروں کو اچھائی کی تلقین کرتے اور برائیوں سے رکنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماہرفن ہیں مگر قرآن وسنت کے علم سے بے بہرہ ہیں وہ جہالت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دین کا علم سیکھتے ہیں‘ مگر ان کے پیش نظر اس کے ذریعے دولت کمانا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ صحیح راستے سے ہٹ کر پُرخطر راستے پر چل رہے ہیں۔ حصولِ علم کے مقدس کام کے ذریعے دنیا کے حقیر فوائد حاصل کرنا بہت بڑی نادانی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِيْ رِيْحَهَا)) (۹)

’’وہ علم جس سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہے (یعنی دین اور کتاب وسنت کا علم) اگر اس کو کوئی شخص دنیا کی دولت کمانے کے لیے حاصل کرے تو وہ قیامت میں جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا۔‘‘

دنیا کمانے کے لیے دین کا علم حاصل کرنے والا علم دین کی تحقیر کرتا ہے اس لیے اسے جنت تو دور کی بات ہے جنت کی خوشبو سے بھی محروم رکھا جائے گا۔

بعض لوگ قصداً درس وتدریس اور تعلیم وتعلّم کی مجالس میں نہیں بیٹھتے اور سمجھتے ہیں کہ جب ایسی مجالس میں جائیں گے تو نئی نئی باتوں کا علم ہوگا‘ پھر ان کے مطابق عمل بھی کرنا پڑے گا تو بہتر ہے کہ نہ وہاں جائیں اور نہ سنیں‘ اس طرح ہم ناواقف رہ کر باز پرس سے بچ جائیں گے‘ کیونکہ ہمارے پاس عذر ہوگا کہ ہمیں ان باتوں کا علم ہی نہ تھا لہٰذا ان پر ہم عمل کیسے کرتے! حالانکہ یہ واضح طور پر شیطان کا دھوکہ ہے‘ کیونکہ ہمیں تو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے

اور علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے‘ یعنی علمی مجالس میں شرکت نہ کرنا تو فرائض سے غفلت کا ارتکاب ہے جو خود گناہ کی بات اور عمل سے فرار کی صورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو قرآن وسنت کا نورانی علم سیکھنے کا ذوق وشوق عطا فرمائے‘ اس پر خود عمل کرنے کی اور دوسروں کو سکھانے اور عمل پر آمادہ کرنے کی توفیق بھی دے۔ آمین یاربَّ العالمین!

حواشی

(۱) سنن ابن ماجه‘ المقدمة‘ باب فضل العلماء والحث على طلب العلم۔

(۲) صحيح البخارى‘ كتاب فضائل القرآن‘ باب خيركم من تعلم القرآن وعلمه۔ وسنن الترمذى‘ ابواب فضائل القرآن‘ باب ما جاء فى تعليم القرآن۔

(۳) سنن الدارمى‘ المقدمة‘ كتاب فى فضل العلم والعالم‘ ح ۳۵۲۔

(٤) رواه ابن راهويه والبخارى فى الواحدان وابن السكن وابن مندة والطبرانى فى الكبير۔ *بحوالہ معارف الحدیث۔*

(٥) سنن الدارمى‘ المقدمة‘ كتاب فى فضل العلم والعالم‘ ح ٣٤٤۔

(٦) سنن الترمذى‘ كتاب العلم‘ باب ماجاء فى فضل الفقه على العبادة۔ وسنن ابى داوٗد‘ كتاب العلم‘ باب الحث على طلب العلم۔

(۷) سنن الترمذى‘ كتاب العلم‘ باب فضل طلب العلم۔ قال ابوعيسىٰ هذا حديث حسن غريب۔

(۸) سنن الترمذى‘ كتاب العلم‘ باب ما جاء فى فضل الفقه على العبادة۔

(۹) سنن ابى داوٗد‘ كتاب العلم‘ باب فى طلب العلم لغير الله تعالىٰ۔وسنن ابن ماجه‘ المقدمة‘ باب الانتفاع بالعلم والعمل به۔ ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات

☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ

☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم

☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

☆ اردو اور انگریزی کتابیں

☆ آڈیو‘ ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

تناظراتِ تعلیم

سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کا ایک مطالعہ

حافظ محمد مشتاق ربانی

علم کے باب میں سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا ایک خاص شانِ نزول ہے' جو علم وحکمت کا ایک عظیم خزانہ اور دین اسلام کی تاریخ کا آغاز ہے۔ تاہم اس شان نزول میں جائے بغیر ہم ان آیات کی روشنی میں اپنے نظامِ تعلیم کا جائزہ اور چند معروضات پیش کر رہے ہیں۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ علم کا اصل ماخذ ومنبع کیا ہے' تعلیم کا آغاز کیسے ہونا چاہیے' نصابِ تعلیم کے خدوخال کیا ہوں؟ صاحبِ علم ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ایسے شخص پر مہربان ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: ((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ))(۱) ''جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے' اسے دین میں تفقہ عطا فرما دیتا ہے۔''

علم حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہیں' لیکن بنیادی ذریعہ یہ ہے کہ انسان کو قراءت و کتابت آتی ہو۔ ان دونوں کے حاصل ہونے کے بعد علم حاصل ہونے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہاں انسان کو یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی ہوگی کہ اللہ ہی علم عطا کرنے والا ہے۔ اس کی توفیق اور مہربانی کے بغیر انسان کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ آیۃ الکرسی میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ''اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ خود چاہے''۔ کوئی تھیوری یا نظریہ اللہ ہی انسان کے ذہن میں الہام کرتا ہے۔ انسان اگر اس کو اپنی طرف منسوب کرے اور کبر کے انداز میں سمجھے کہ میری کوشش' قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر ایسا ہوا ہے تو یہ طرزِ عمل قارون کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ ﴿قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾ (القص:۷۸) ''اس نے کہا کہ مجھے جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب العلم قبل القول والعمل۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق .....

کی بدولت ملا ہے''۔ جبکہ ایک اطاعت شعار مسلمان کا رویہ وہ ہوتا ہے جو ملائکہ نے اختیار کیا۔ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (البقرۃ) ''انہوں نے کہا کہ تو پاک ہے' ہمیں تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے''۔ یہی بات ان آیات میں سکھائی گئی ہے کہ علم عطا کرنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ وہ انسان کی ایسے ایسے اکتشافات کے بارے میں راہنمائی کرتا ہے کہ لوگ ان ایجادات کی بدولت شہرت حاصل کر لیتے ہیں' اور انہیں صرف اپنا کمال سمجھتے ہیں' حالانکہ حقیقی راہنمائی کرنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ ایسے مواقع پر سائنسدانوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں' جیسے حضرت داؤد علیہ السلام زرہ سازی کا ہنر حاصل ہونے پر اللہ کا شکر بجالانے والے تھے۔ یہی بات ہم اس سورت میں پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات علم عطا کرنے والی ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد آیئے سورۃ العلق کی آیات کا موجودہ نظامِ تعلیم کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہیں۔

○ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ ''پڑھو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) اپنے ربّ کے نام کے ساتھ' جو پیدا کرنے والا ہے''۔ اپنے رب کے نام سے پڑھنے کا ذکر راہنمائی کرتا ہے کہ تعلیم کی بنیاد توحید پر ہو۔ توحید انسان کے باطن کو منوّر کر دیتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ (النور:۳۵) ''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے''۔ حضرت لقمانؑ نے بھی اپنے بیٹے کی تربیت کا باقاعدہ آغاز توحید سے کیا: ﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمٰن) ''اے میرے بیٹے' اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ' بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے نصاب تعلیم وحیٔ الٰہی کے مطابق بنائیں۔ پروفیسر رشید احمد انگوی اپنی کتاب ''براہیم کی تلاش'' کے ایک مضمون ''تعلیم اور انقلاب'' میں لکھتے ہیں: ''ہمیں یقین ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم جب اللہ کے نام کے ساتھ اور اس کی عطا کردہ ہدایت کے ساتھ منسلک ہو جائے گا تو پھر وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرے گا۔''

ہمارے قدیم نظامِ تعلیم میں ہمارے آباء واجداد کا یہی دستور رہا ہے کہ وہ بچے کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید اور اسلام کی مبادیات سے کرتے' تاکہ بچے کی زندگی کا رُخ متعین ہو جائے۔ اس نے جو بھی شعبہ زندگی کیریئر کے طور پر منتخب کرنا ہے اس میں دین اسلام سے وفاداری اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مضبوط تعلق استوار دکھائی دے۔ ہمیں بھی اپنے طلبہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت پیدا کرنی چاہیے اور وحی الٰہی کی روشنی میں اپنے علمی سفر کا

آغاز کرنا چاہیے۔ جب ہم اپنے رب کی دی ہوئی راہنمائی کے مطابق علم میں آگے بڑھیں گے تو گمراہی وضلالت کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ کئی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن ان کے افکار ونظریات اللہ کی ہدایت کے برخلاف ہوتے ہیں۔

اِقْرَأْ کو اگر سیاق وسباق کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ تلاوت کے مفہوم میں ہے' یعنی جو آپؐ پر اتارا جا رہا ہے اس کی تلاوت کریں' جبکہ ہمارے ہاں اقرأ کو ہمیشہ سیاق وسباق سے کاٹ کر سمجھا جاتا ہے۔ اقرأ میں زبان سیکھنے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کس زبان میں پڑھا جائے۔ ہر زبان اپنا پورا کلچر اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اس میں تاریخ' رہن سہن' کھانا پینا' ادب' فنون' عبادات اور قانون ہر چیز ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان بچے کی تعلیم ایسی زبان میں ہو جو اپنے دین سے دور نہ کرے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو عربی زبان ہمارے بچوں کی تعلیم کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسری زبانوں کو ہم یکسر نظر انداز کر دیں۔ دوسری زبانوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے' لیکن ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ بچے کی تعلیم کی اُٹھان کس زبان میں ہو۔ اس لحاظ سے یہ بات موزوں دکھائی دیتی ہے کہ عربی زبان اس اعتبار سے مناسب ترین ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: **تَعَلَّمُوا الْعَرَبِيَّةَ فَإِنَّهَا مِنْ دِيْنِكُمْ**۔ ''عربی سیکھو' کیونکہ یہ تمہارے دین کا حصہ ہے۔''

سورۃ العلق کی پہلی آیت میں ''اَلَّذِیْ خَلَقَ'' انتہائی قابلِ توجہ ہے' کیونکہ اس میں لطافت کا پہلو ہے۔ ماہرینِ تعلیم کے نزدیک تعلیم میں لطافت کو پیش نظر رکھنے سے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اگر درشتگی ہو' خوف کی فضا ہو' مار پیٹ اور تشدد کا عنصر ہو تو اس سے تعلیم دینے میں کئی طرح کی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں' اسی لیے اب سکولوں اور تعلیمی اداروں میں طالب علم کو مارنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

''اَلَّذِیْ خَلَقَ'' میں عموم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ جو چیزیں انسان بناتا ہے' ان کا حقیقی صانع بھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت) ''حالانکہ تم کو اور جو تم بناتے ہو اس کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔'' (ترجمہ فتح محمد خان جالندھریؒ) اس آیت میں مَا موصولہ ہے' مصدریہ نہیں ہے۔ یعنی اللہ نے تم کو پیدا کیا اور جن پتھروں کو تم تراش کر بت بناتے ہو ان کو بھی اللہ نے پیدا کیا۔ تو جس کو اللہ نے پیدا کیا وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے؟

○ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (العلق) ''پیدا کیا انسان کو جمے خون سے''۔ عَلَق' عَلَقَة کی جمع ہے۔ اس آیت میں انسان کی تخلیق کا ذکر ہے۔ اس تخلیق کا پہلا مرحلہ نُطفه' دوسرا عَلقه اور تیسرا مُضغه ہے۔ یہاں دوسرے مرحلے کا ذکر کر کے باقی مراحل کی طرف توجہ مبذول کروانا ہے۔ علق کا ذکر شاید اس لیے ہوا تا کہ فواصل برقرار رہیں۔ علق (جمع) اس لیے بھی لایا گیا ہے' کیونکہ اس آیت میں تمام انسانوں کی تخلیق کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

انسانی تخلیق کا جب بھی ذکر آتا ہے تو جہاں اس سے اللہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے' وہیں معاد کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ جس خالق نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا' وہ تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

یہ آیت ان آیات کے درمیان وارد ہو رہی ہے' جن کا موضوع علم ہے۔ اس سے ہمیں یہ راہنمائی مل رہی ہے کہ نصاب میں عقیدۂ آخرت کا جاندار انداز میں ذکر انتہائی ناگزیر ہے۔ اس سے طلبہ وطالبات میں مسئولیت کا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ تعلیمی نصاب میں سے اگر اس عقیدہ کو حذف کر دیا جائے' اس پر زور نہ دیا جائے تو پھر طالب علم میں بغاوت پیدا ہوگی۔ ان آیات کے بعد اسی لیے فرمایا: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى﴾ (العلق) ''ہرگز نہیں! بے شک انسان سرکشی کر رہا ہے''۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نصابِ تعلیم مرتّب کرنے والے حضرات اور معلّمین عقیدۂ آخرت کو خصوصی طور پر اُجاگر کریں۔ اس سے متعلّمین کے رویہ میں مثبت تبدیلی پیدا ہوگی اور وہ ذمہ دار شہری بن کر قوم وملّت اور دین اسلام کی خدمت کر سکیں گے۔ اس سے وہ والدین اور اساتذہ کے بھی فرمانبردار بنیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ اپنے اساتذہ کا ادب و احترام سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی نسبت زیادہ کرتے ہیں۔

○ ﴿اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾ ''پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے''۔ الاکرم مبالغے پر دلالت کر رہا ہے۔ یہاں پھر اقرأ (پڑھو) آیا ہے۔ کئی مفسّرین کرام نے بیان کیا ہے کہ پہلی قراءت آنحضور ﷺ کے لیے تھی اور دوسرے اقرأ میں آپ ﷺ کو تبلیغ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے معارف القرآن میں بیان کیا ہے کہ پہلا اِقرأ آنحضور ﷺ کے لیے اپنے لیے تھا جبکہ دوسرے اقرأ میں قراءت دوسروں کے لیے تھی تا کہ آپؐ تبلیغ کریں۔ (مزید برآں مفتی صاحب مرحوم نے تکرار کا عنصر بھی بیان کیا ہے) مفسرین کرام کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح علم حاصل کرنا نہایت اہم ہے اسی طرح

دوسروں تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔ یہ بخل کی ایک صورت ہے کہ ہم کوئی صحیح بات جانتے ہوں لیکن اس سے دوسروں کو آگاہ نہ کریں اور اسے چھپائیں۔ علم کا دوسروں تک پہنچانا صرف پیشہ ور معلّمین ہی کا کام نہیں بلکہ معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ علم کے فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔

اِقرأ کے مخاطب اور رَبُّكَ میں كَ ضمیر متصل سے مراد آنحضور ﷺ ہیں۔ اس سے عیاں ہو رہا ہے کہ تعلیم کے میدان میں ایمان بالرسالت کتنا اہم ہے۔ ہم جس علم پر بھروسہ کرتے ہیں وہ وحی کا علم ہے اور یہ وحی آنحضور ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ طلبہ وطالبات میں ایمان بالرسالت کی ضرورت واہمیت اُجاگر کی جائے اور ختمِ نبوت کا عقیدہ پورے شدّومدّ کے ساتھ بیان کیا جائے تاکہ نئی نسل میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو سکے۔ قادیانی حضرات پہلے اقرأ کے مخاطب نبی اکرم ﷺ کو سمجھتے ہیں اور دوسرے اقرأ کے مخاطب سے مراد ''مسیح موعود'' (مرزا غلام احمد) لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ قادیانی کتنی ڈھٹائی سے قرآن مجید کی باطل تاویلیں کرتے ہیں۔ لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام کے ذریعے سے اس فتنہ کا سدباب کریں۔

الاکرم اور الرحمٰن اللہ کے صفاتی نام ہیں' جو اللہ کے لطف وکرم اور اس کی رحمت کا مظہر ہیں۔ جیسے یہاں قراءت کے ساتھ الاکرم بیان ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ اُمّی تھے لیکن اللہ کا ان پر کرم ہوا کہ انھیں سب سے بڑا معلم بنا دیا۔ اسی طرح سورۃ الرحمٰن میں صفت رحمت کے بعد تعلیم قرآن اور تخلیق انسان کا تذکرہ ہوا' جس سے عیاں ہو رہا ہے کہ صفت رحمت اور صفت کرم کا مظہر علم اور خصوصاً علم قرآن ہے۔

○ ﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴﴾ ''جس نے قلم سے سکھایا''۔ اس آیت میں قلم کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۝۱﴾ (القلم) ''ن۔ قلم کی اور جو (اہلِ قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم''۔ خط وکتابت بیان کی ایک قسم ہے' اور یہ کسی دستاویز کو محفوظ بنانے کا ذریعہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: قَیِّدُوا الْعِلْمَ بِالْکِتَابِ (۱) ''علم کو لکھ کر محفوظ کرو''۔ کتابت کی ضرورت واہمیت ہر دور میں مسلم چلی آ رہی ہے۔ کمپیوٹر بھی دراصل کتابت کی ایک شکل ہے۔ کمپیوٹر قلم کی طرح ایک آلہ ہے جو ہمیں علم اور

(۱) سنن الدارمی' المقدمہ' باب من رخص فی کتابۃ العلم۔

انفارمیشن کی طرف لے کر جاتا ہے۔ لہٰذا اس کو سیکھنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ کوئی شخص اگر کمپیوٹر پر کام نہیں کر سکتا تو موجودہ دَور کے اعتبار سے اس کے پڑھے لکھے ہونے پر شبہ کیا جاتا ہے' چاہے وہ کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ ہو۔ اب قلم سے بھی زیادہ کمپیوٹر پر کتابت وکمپوزنگ کی جاتی ہے۔ اس آیت کا اسلوب ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں کتابت کی اہمیت بیان کی جا رہی ہے۔ قلم انسان کے پاس ایک امانت ہے' اس امانت کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کو قلم سے لکھنا آ جائے تو وہ لوگوں میں غلط نظریات اور غیر اسلامی تصورات پھیلانا شروع کر دے' ایسا نصاب تیار کرے جو بچوں کے ذہنوں کو پراگندہ کر دے' ظلم پر مبنی دستاویزات تیار کرنا شروع کر دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪﴾ (البقرۃ:۲۸۲) ''اور تمہارے مابین لکھنے والا انصاف سے لکھے۔''

○ ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝۵﴾ ''انسان کو وہ کچھ سکھایا جس کا اس کو علم نہ تھا''۔ اللہ نے انسان کے لیے علم کے کئی ذرائع پیدا کیے۔ صحیح علم کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے سماعت' بصارت اور عقل دی تاکہ ان کو استعمال کر کے انسان علم حاصل کرے۔ یہاں پر انسان کا ذکر ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ پروفیسر خورشید عالم اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''لغات قرآن اور عورت کی شخصیت'' میں الانسان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ الناس سے اسم جنس ہے جس کا اطلاق مذکر ومؤنث اور واحد وجمع پر ہوتا ہے۔ قرآن نے مرد اور عورت کے لیے انسان استعمال کیا ہے اور یہی لغت فصحی ہے''۔ الانسان کی یہ بحث اس لیے کی گئی ہے کہ علم مرد وعورت دونوں کا حق ہے' کسی جنس کو اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اس آیت میں یہ بھی مفہوم ہے کہ صرف قلم ہی ذریعہ تعلیم نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اور بھی ذرائع پیدا کیے ہیں جس میں سے ایک عقل ہے۔ عقل سے بھی انسان بہت سی چیزیں سمجھتا ہے۔ علم کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ وحی ہے۔ یہ علم کا سب سے اہم ذریعہ ہے' جس کا تجربہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کو رہا۔ ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ الہام بھی ہے کہ کوئی بات اللہ کسی کے ذہن میں ڈال دے۔ وجدان بھی ذرائع علم میں سے ہے۔ تجربات ومشاہدات بھی علم کے ذرائع ہیں۔ علم کا ذریعہ زبانی تعلیم بھی ہے جو ہم دوسروں سے سنتے ہیں۔ اس میں صرف یاد رکھنے کی بات ہے کہ کسی کا علم ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے علم میں اضافے کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ''اے میرے ربّ! میرے علم

میں اضافہ فرما۔‘‘

معلوم نہیں کہ لوگوں کو علم کی اہمیت وفضیلت کے حوالے سے صرف سورۃ العلق کی ابتدائی آیات ہی کیوں نظر آتی ہیں‘ حالانکہ یہ وحی کا آغاز ہے‘ اس کے بعد بھی نبی کریم ﷺ پر وحی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ پھر اگر ان ہی آیات سے راہنمائی لینی ہے تو صرف ایک لفظ ’’اقرأ‘‘ پر یا صرف پہلی آیت پر ہی کیوں اکتفا کرتے ہیں؟ آگے بھی پڑھنا چاہیے—— ان پہلی پانچ آیات سے پوری طرح مستفید ہوں۔ یہ پانچ آیات ہمارے پورے تعلیمی نظام کی سمت درست کر سکتی ہیں۔ ان آیات کے نزول اور فترۃ کے بعد سورۃ المدثر کی آیات نازل ہوئیں: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ’’(اے محمد ﷺ) جو کپڑا لپیٹے ہوئے ہو۔ اُٹھو اور انذار کرو۔ اور اپنے پروردگار کی کبریائی بیان کرو۔‘‘

ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کو بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو انذار کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اپنے رب کی کبریائی ہر سطح پر بیان کریں۔ اپنے رب کو دنیا کے سامنے بڑا ثابت کرو۔ یہی جہاد ہے۔ ہمارے ہاں سیکولرازم کے شکار لوگوں کو سورۃ الانفال‘ التوبہ‘ الاحزاب اور الصّف جیسی سورتیں کھٹکتی ہیں۔ عام طور پر جہاد سے متعلق آیات وسورتوں کو نصاب سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جہاد سے متعلق مواد نکالنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بزدل مسلمان طالب علم تیار ہوں گے۔ ان میں حمیّت وغیرت جیسی صفات کا فقدان ہوگا۔ یہی بات اعدائے اسلام چاہتے ہیں۔ وحی کا جہاد والا پہلو ہم نظر انداز کر رہے ہیں اور سارا زور اقرأ پر دیے جا رہے ہیں۔ تبلیغِ دین اور اقامتِ دین کی ذمہ داری قراءت وکتابت کے ساتھ منسلک ہے۔ ہمیں یہ سارے کام کرنے چاہییں۔ دین کے سارے کام ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ کسی ایک کام پر فوکس نہیں کرنا چاہیے‘ تاکہ انتہا پسندی کا خاتمہ ہو۔ ابلاغ اور اقامتِ دین کی ذمہ داری صرف چند مخصوص لوگوں کی نہیں ہے بلکہ معاشرے کے ہر فرد کی ہے‘ چاہے وہ معلّم ہو یا متعلّم۔ اسے اپنے اوقات کو پیش نظر رکھ کر اس ذمہ داری کو ادا کرنا چاہیے۔ طالب علم کے لیے اولین کام علم حاصل کرنا ہے‘ اس کو ہر حال میں ترجیح دینی چاہیے‘ البتہ اس میں جو فارغ وقت ہو اس میں سے کچھ احیائے اسلام کے لیے لگانا چاہیے اور اپنی دیگر ذمہ داریوں کو بھی مدّنظر رکھنا چاہیے۔

❁❁❁

❁ ہمارا دین ’’دینِ توحید‘‘ ہے اور ’’توحید‘‘ کی ضد ’’شرک‘‘ ہے۔

❁ شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور ناقابلِ درگزر ہے۔

❁ قرآن کی رو سے شرک ’’ظلمِ عظیم‘‘ ہے۔

❁ شرک ہر دور میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔

❁ مسلمان جہالت اور ناسمجھی کے سبب شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت‘ اور دورِ حاضر کے شرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

حقیقت واَقسامِ شرک

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے چھ فکر انگیز خطابات

❁ معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ❁ عمدہ طباعت ❁ 128 صفحات

قیمت: اشاعت عام: 50 روپے‘ اشاعت خاص: 90 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خدام القرآن لاہور**

36۔ کے‘ ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org

حقوق وفرائض

اُمّ عمار عبدالخالق

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس دنیا میں حقوق وفرائض کے بندھنوں میں باندھ کر بھیجا ہے۔ میزانِ عدل وقسط ایک ایسا ترازو ہے جو اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے' جس میں حقوق وفرائض کی نہایت عادلانہ تقسیم کی گئی ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ۝۷﴾ (الرحمٰن) ''اور اُس نے میزان رکھ دی ہے''۔ گویا یہ کائنات انتہائی عادلانہ نظام کے تحت چل رہی ہے۔ سوائے اس کے اتنے حصے کے کہ جس کا اختیار اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو عطا کیا اور انسان نے اس حصے میں بدنظمی اور بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔

قرآن پاک میں ارشادِ مبارک ہے' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین پر فساد انسان کا اپنے فرائض میں غفلت برتنے اور اپنے مقاصد اور اپنی ذمہ داریوں سے انحراف کا نتیجہ ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم:۴۱)

''بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے۔''

بقیہ تمام نظام ہائے ارض وسما' جس کا اختیار اللہ نے انسان کو نہیں دیا' وہ انتہائی توازن اور عدل و قسط سے جاری وساری ہیں۔ جو ڈیوٹی اللہ نے سورج کی لگا دی ہے اس کی مجال نہیں کہ ذرّہ برابر بھی اس میں کوتاہی کرے۔ اسی طرح جو ڈیوٹی اللہ نے چاند کی لگا دی ہے اس میں سرمو کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی جب تک کہ ذات باری تعالیٰ خود نہ چاہے۔ جب سے زمین و آسمان بنے ہیں تمام چیزیں اسی طرح اللہ کا حکم مان رہی ہیں جیسا اللہ نے ان کو حکم دیا۔ قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝۴۰﴾ (یٰسٓ)

''سورج کی مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ ہی رات دن سے پہلے آ سکتی ہے' اور ہر ایک طے شدہ مدار میں تیر رہا ہے۔''

کائنات کا نظام جس توازن کے ساتھ جاری وساری ہے اسی کو اگر ہم بہت چھوٹی سطح پر دیکھنا چاہیں تو ایک خاندانی نظام ہمارے سامنے موجود ہے' جو توازن سے چلتا رہے تو یہ نظام درست رہتا ہے' اور اس توازن کا نام حقوق وفرائض کی ادائیگی ہے۔ اگر خاندانی نظام میں فساد برپا ہو جائے یا حقوق وفرائض میں عدم توازن پیدا ہو جائے تو یہ خاندانی نظام بھی فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مسجودِ ملائک' حضرت انسان کو زمین کا خلیفہ نامزد کرنے کے بعد اس کو بھی زمین پر ایک نظام قائم کرنے کا حکم دیا گیا اور وہ عدل وقسط والا نظام ہے:

﴿اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ۝۸ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ۝۹﴾ (الرحمٰن)

''یہ کہ میزان کے بارے میں زیادتی نہ کرو۔ وزن انصاف کے ساتھ قائم کرو اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔''

ایسا نظام قائم کرنے سے منع کر دیا کہ جس میں انصاف اور عدل وقسط نظر نہ آئے' بلکہ مزید فرمایا کہ ''میزان کو قائم رکھو انصاف کے ساتھ''۔ گویا ''اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ'' ترازو کی ڈنڈی ہے' جس کی گھنڈی انسان کے ہاتھ میں ہے۔ اس میزان میں ایک طرف تو بغاوت اور سرکشی سے روک دیا گیا تو دوسری طرف عدل وانصاف میں کمی سے روک کر میزان کو برابر رکھنے کا حکم دیا گیا۔

زمانہ گواہ ہے کہ جب تک انسان نے نظامِ عدل وقسط قائم رکھا' امن وامان قائم رہا۔ لیکن جب انسان اپنے مقصد سے ہٹ گیا اور خود غرضی سے مَن چاہا نظام نافذ کرنے کی کوشش کی اس نے ہمیشہ مُنہ کی کھائی اور زوال پذیر ہوا۔

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

عدل وانصاف کے بارے میں سورۃ النساء میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ﴾ (النساء:۱۳۵)

''اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر اگرچہ یہ (انصاف کی شہادت) تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے

والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ چاہے وہ خوشحال ہوں یا محتاج' تو اللہ ہی ان کا مددگار ہے۔ پس تم پیروی نہ کرو خواہش کی بایں صورت کہ تم عدل نہ کر سکو۔''

یہ آیت لرزا دینے والی ہے' جس میں اللہ تعالیٰ ان رشتوں کے خلاف حق کی گواہی مانگ رہا ہے جس میں انسان ہمیشہ مار کھا جاتا ہے۔ اللہ کے حق میں گواہی دینا رشتہ داروں کے خلاف' والدین اور خود اپنے خلاف بھی بہت مشکل ہے' لیکن یہ اللہ کا حکم ہے۔

سورۃ المائدۃ میں عدل وانصاف کی تشریح بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫﴾ (المائدۃ:۸)

''اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے انصاف کے گواہ بن کر' اور تمہاری کسی قوم سے دشمنی تمہیں اس بات پر مجبور نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو' اس لیے کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

سورۃ النساء کی آیت کے مقابلے میں اس آیت میں ایک اضافہ ہے: ﴿اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی طور پر بھی عدل کو نافذ کرو اور آپس میں رشتوں کے ساتھ بھی عدل کرو' کیونکہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ہم نظام عدل وقسط قائم کریں گے اور ہر ایک کو عادلانہ نظام کے تحت انصاف دیا جائے گا تو ایک ایک فرد سے لے کر پورے معاشرے اور حکومت تک تمام لوگ امن وسکون سے رہیں گے—— نبی اکرم ﷺ نے ایسا نظامِ عدل وقسط قائم کر کے دکھایا جس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ یا اللہ کے حق میں انصاف کے لیے کھڑے ہو جاؤ! نبی اکرم ﷺ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عادلانہ نظام ہمارے سامنے موجود ہے' جس میں انفرادی طور پر بھی حق بات کرنے اور اپنا حق مانگنے میں ہر کوئی مکمل طور پر آزاد ہے۔ ایک بڑھیا بے انتہا جلال والے امیر کے سامنے اپنی بات کا آزادانہ اظہار کر سکتی ہے' جبکہ عدل کا تو یہ عالَم ہے کہ وقت کا قاضی ان کو اپنی عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیتا ہے تو حاضر ہوتے ہیں۔ یہ وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو حمایت حق کے جلال میں' مسلمانی کے دعوے دار منافق کی گردن اڑا دینے سے نہیں چوکتے— جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بڑوں کے سامنے بولنا نہیں چاہیے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں!!

درحقیقت حق بات کے لیے آواز اٹھانا ہر انسان کا خداداد حق ہے جس کو سلب کرنا زیادتی اور ظلم ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا:

''میرے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ طاقتور اس وقت تک کمزور ہے جب تک میں اس سے کسی کا چھینا ہوا حق واپس نہ لے لوں اور تم میں سب سے زیادہ کمزور میری نظر میں اس وقت تک طاقتور ہے جب تک میں اسے اس کا چھینا ہوا حق واپس نہ دلوا دوں۔''

اور ہم کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں' اپنا حق نہ مانگو' مخالفتیں ہوں گی! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد برپا کرنے والے ہم خود ہیں' جیسا کہ پہلے آ چکا: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ﴾۔

حقوق وفرائض صرف انسانوں کے مابین نہیں ہوتے بلکہ اللہ اور بندے کے مابین بھی ہیں' جن کو حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے' اور بندوں کے مابین بھی ہوتے ہیں' جنہیں حقوق العباد کہتے ہیں۔ اسی طرح میں یہ بات بہت جسارت کر کے کہہ رہی ہوں کہ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ اللہ پر بھی بندوں کا حق ہے۔ ان شاء اللہ آگے اس کی وضاحت کر دوں گی —— اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا بھی اُمتیوں کے ساتھ حقوق وفرائض کا تعلق ہے—— کتاب اللہ کے بھی حقوق و فرائض ہیں —— عام انسانی زندگی میں اگر مشاہدہ کریں تو ہر ایک انسان' ایک عام کام کرنے والی ملازمہ سے لے کر ملک کے حکمران تک' حقوق وفرائض میں بندھا ہوا نظر آتا ہے اور یہ نظام مضبوط اور مربوط انداز میں قائم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم خود ہی حقوق وفرائض میں کمی بیشی یا حق تلفی یا کسی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیں' جیسا کہ آج کل دنیا میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً یہ بیماری رچ بس گئی ہے' جس کی نشاندہی اللہ ربّ العزت نے ان الفاظ میں کی ہے:

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۝۵۱﴾ (الانفال)

''یہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے اور اللہ تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

صرف ناپ تول میں کمی کرنے یعنی میزان میں عدمِ توازن پیدا کرنے پر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہوا۔ کجا نفسانفسی کا یہ عالَم کہ ہر ایک اپنے معاملے میں خودغرض اور دوسروں کے حق غصب کرنے والا ہے' چاہے دوسرے کی زندگی اجیرن ہوتے ہوتے تباہی کے گڑھے تک پہنچ جائے۔ ایسی قوم سے کیا اللہ راضی ہو سکتا ہے؟ کیا اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت کے ہم مستحق ہو سکتے ہیں؟ کیا ان اہلِ قرآن کی قیامت کے روز قرآن

شفاعت کرسکتا ہے جو کھلم کھلا دوسروں کے حقوق تلف کر رہے ہوں ناانصافی کا بازار گرم کر رہے ہوں؟ ان حق تلف کرنے والوں اور میزان میں عدم توازن پیدا کرنے والوں کے لیے قیامت کے روز کوئی پناہ گاہ نہیں ہوگی۔ کوئی سفارش' کوئی فدیہ قبول نہ ہوگا۔ یہ ظلم اللہ معاف نہیں کرے گا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت ہی نہیں دیتا۔ بندوں کے بندوں پر یا انسانوں پر انسانوں کے حقوق و فرائض انسان ہی معاف کرے گا تو اللہ کی طرف سے معافی کا اعلان ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے۔ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا: ''کیا تم جانتے ہو کہ میری اُمت کا مفلس شخص کون ہے؟'' صحابہ کرامؓ نے جواب دیا: ''ہماری نظر میں مفلس شخص وہ ہے جس کے پاس مال و دولت نہ ہو' درہم و دینار نہ ہوں''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِصَلَاةٍ وَصِیَامٍ وَزَکَاةٍ وَیَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَکَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا' فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ' فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ))(۱)

''قیامت کے دن میری اُمت کا مفلس وہ آدمی ہوگا کہ جو نماز' روزے' زکوٰۃ وغیرہ سب کچھ لے کر آئے گا' لیکن اُس نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی' کسی پر تہمت لگائی ہوگی' کسی کا مال کھایا ہوگا' کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا' تو ان سب کو اس آدمی کی نیکیاں دے دی جائیں گی' اور اگر اس کی نیکیاں ان کے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ہی ختم ہوگئیں تو ان لوگوں کے گناہ اس آدمی پر ڈال دیے جائیں گے' پھر اس آدمی کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک انسان کا آخرت میں نجات کے لیے دوسرے کے حقوق دیانت داری سے ادا کرنا کس قدر ضروری ہے۔

حقوق و فرائض کا مفہوم

اس تمہیدی گفتگو کے بعد حقوق و فرائض کا مطلب سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ یہ انتہائی

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔ وسنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔

نازک اور حساس موضوع ہے۔ اس وقت ہمارا معاشرہ بدنظمی اور افراط و تفریط کا شکار ہے' بے حسی اور خودغرضی کی دبیز چادر اُمت مسلمہ نے بحیثیت مجموعی اوڑھی ہوئی ہے' لہٰذا یہاں حق کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ عربی کا مقولہ ہے: اَلْحَقُّ مُرٌّ (حق کڑوا ہوتا ہے) چنانچہ حق کا اعلان کرنے والے بھی کڑوے ہوجاتے ہیں۔ اس خوف کی وجہ سے کوئی بھی حق بات نہیں کرنا چاہتا۔ (الا ماشاء اللہ!)

کسی کے حقوق تلف کرنے والے کو زیادہ نقصان ہوتا ہے بہ نسبت اُس کے جس کے حقوق تلف کیے جا رہے ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں حقوق و فرائض کی پہچان اور دوسروں کے حقوق ادا کرنا تو بہت دور کی بات ہے' دوسروں کے حقوق ضبط کرنا اور ان کو بھی اپنا ہی حق سمجھ لینا کامیابی سمجھا جاتا ہے۔

حق: جو واقعی ہو' حقیقی ہو' عقلاً مسلم ہو اور اخلاقاً واجب ہو۔ میرے حق کا مطلب ہے میرے فائدے' میری ضرورت اور میری ساخت کے مطابق میرے لیے آسانیاں' سکون وغیرہ جو اللہ نے مجھے عطا کی ہیں۔

فرض: میرے فرائض کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جو ذمہ داریاں اور میری ساخت کے مطابق جو فرائض عاید کیے ہیں' ان کو احساسِ ذمہ داری کے ساتھ طوعاً یا کرہاً لازمی طور پر ادا کرنا۔ اپنے فرض کی ادائیگی میرے اختیار میں ہے' جو آسان بھی ہے (اگرچہ فرض ہمیشہ گراں گزرتا ہے) اور آخرت کے اعتبار سے حساب کتاب میں بہت ہلکا بھی۔ کیونکہ حقوق اللہ تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے مگر حقوق العباد جب تک انسان معاف نہ کریں' معاف نہیں ہوں گے۔

حقوق و فرائض اللہ کی طرف سے عائد کردہ ہیں

یہ حقوق و فرائض انفرادی طور پر ہر مرد و عورت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ہیں۔ جو میرے فرائض ہیں وہ دوسروں کے حقوق ہیں۔ اگر میں دیانت داری سے اپنے فرائض ادا نہیں کروں گی تو لازماً میں دوسروں کی حق تلفی کر رہی ہوں گی۔ اور اگر دوسرا فرد اپنی ذمہ داری یا اپنے فرائض شعوری طور پر ادا نہیں کر رہا ہوگا تو لازماً اس طرح میری حق تلفی ہوگی۔ اپنا فرض نبھانے میں اگر میں کوتاہی کرتی ہوں' اور اس طرح میں جس انسان کی حق تلفی کرتی ہوں' وہ اپنے حق کے لیے اگر آواز اٹھاتا ہے تو وہ پوری طرح حق بجانب ہے' کیونکہ اس معاملے میں کوئی برتر یا کمتر نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگرچہ جس نے اپنا حق

مانگا تو ''اَلْحَقُّ مُرٌّ'' کے مصداق ہوسکتا ہے اس کو مزید سختی کا سامنا کرنا پڑے' البتہ اگر وہ حق معاف کر کے صبر کا دامن تھامتا ہے تو اللہ اس کے ساتھ ہے اور مجھے اس ظلم یا فرض میں کوتاہی یا دوسرے کا حق نہ دینے کا خمیازہ جلد یا بدیر بھگتنا پڑے گا۔ اِلا یہ کہ میں اس سے معافی مانگوں یا اس کی اس حق تلفی کی کوئی تلافی کروں یا اس کا حق اسے لوٹاؤں۔ اور یہ میں احسان جتا کے نہیں' بلکہ خوفِ الٰہی اور جواب دہی کے احساس سے احسن طریقے سے کروں —— اہلِ ایمان کا طرزِ عمل تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات دے کر بھی ان غرباء ومساکین سے عاجزی سے کہتے ہیں:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝﴾ (الدھر)

''بے شک ہم تو تمہیں اللہ کی رضا کی خاطر ہی کھلاتے ہیں' ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکر گزاری کے خواہش مند نہیں ہیں۔ بے شک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے' ایسے دن سے جو بہت ہی سخت ہوگا اور بے حد طویل ہوگا۔''

کجا یہ کہ ہم اپنا فرض ادا کر کے کسی پر احسان نہیں کر رہے بلکہ اس کا وہ حق لوٹا رہے ہیں جو ہم نے غصب کیا ہے اور جو ہم پر عائد ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس کو اپنا محسن سمجھتے ہوئے (کہ اُس نے چاہنے کے باوجود اپنا حق نہیں مانگا اور صبر کیا) اس کو اس کا حق ادا کریں —— حق چاہے فرض کی صورت میں ہو یا باہمی حقوق کی صورت میں' کڑوا ضرور ہوتا ہے' لیکن ان فرائض کی خلوص سے ادائیگی پر ہی دنیا میں باہمی رنجشیں' بدگمانیاں' دشمنیاں اور قطع تعلقیاں ختم نہ سہی لیکن کم ضرور ہوں گی اور ایک دوسرے کے لیے رحمت' محبت' حسن سلوک اور ایثار وقربانی کے جذبات پیدا ہونا شروع ہوں گے۔

اب تک کی گفتگو کا اگر ہم خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ صرف اور صرف اپنے فرائض پر گہری نظر رکھی جائے اور اس کو دیانت داری سے اللہ کا حکم اور اس کی رضا حاصل کرنے کی خاطر ادا کیا جائے' اور اپنے فرائض کی ادائیگی پر انسانوں سے کسی اجر یا حسن سلوک کی امید اور توقع رکھنے کی بجائے خالصتاً اللہ سے اجر کا طالب رہا جائے: ﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ ''میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے!'' —— اپنے فرائض کو ادا کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ان کی ادائیگی سرفہرست رہنی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر فرد سے معاشرے اور حکومت تک امن وسکون محض خوش خیالی ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث کا مفہوم ملاحظہ ہو کہ

نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ دو عورتوں میں سے کون سی بہتر ہے؟ ایک وہ جو نماز' روزے اور دیگر عبادات میں تو آگے آگے ہے مگر ہمسائے اس کی بدسلوکی اور بداخلاقی کی وجہ سے پریشان ہیں' جبکہ دوسری عورت نماز' روزے اور عبادات میں صرف فرائض پر اکتفا کرتی ہے لیکن اس کے ہمسائے اس سے خوش ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(وہ عورت بہتر ہے) جس کے ہمسائے اس سے راضی ہیں''۔ ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو چھ حقوق ہیں ان میں ہمسائیگی کا حق بہت نمایاں ہے۔

حقوق وفرائض' اللہ اور بندوں کے درمیان

اللہ کا حق ہم پر یعنی انسانوں پر از روئے قرآن یہ ہے: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ (بنی اسراء یل:۲۳) ''اور تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔ بندگی اور غلامی میں' اطاعت اور محبت میں' اخلاص اور نفس کی خواہشات میں' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور کسی انسان یا کسی بھی مخلوق کو اللہ کا مدِمقابل نہ ٹھہرانا (یعنی مخلوق میں سے کسی کا درجہ اللہ کے ہم پلہ یا بلند تر نہ ماننا) ہی عبدیت ہے اور یہی غلامی ہے۔ انسانوں کی تخلیق کا مقصد بھی ''عبادتِ رب'' ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ (الذّٰریٰت)

''اور میں نے جنّوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

یہی اللہ کا حق ہے بندوں پر۔ اگر انسان اپنے آپ کو عبدیت یا غلامی میں نہیں ڈھالتا تو گویا وہ اللہ کے حق میں ڈاکہ ڈال رہا ہے —— عبدیت کے مفہوم کو اگر ہم سمجھنا چاہیں تو غلام (عرب دور والا) اور ملازم جو جز وقتی رکھا گیا ہو' کے حوالے سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ملازم تو آٹھ دس گھنٹے کام کرنے کے بعد فارغ ہو جائے گا اور پھر اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا' وہ جہاں چاہے جائے' جو چاہے کرے' آپ اس کو کچھ کہہ نہیں سکتے۔ جبکہ غلام کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی تھی۔ غلام تو دن رات یعنی چوبیس گھنٹے اپنے آقا کے قبضے میں ہوتا تھا' اُس کے حکم کے بغیر نہ وہ کہیں جا سکتا تھا نہ وہ اپنی مرضی کر سکتا تھا' وہ مکمل طور پر اپنے آقا کا محتاج ہوتا تھا۔

یہی حیثیت عبداللہ یعنی اللہ کے غلام کی ہے' لیکن اللہ کی ہمہ وقتی غلامی انتہائی محبت اور عاجزی سے ہوگی تو عبدیت کا مفہوم پیدا ہوگا اور تبھی اللہ کے ہاں قابل قبول ہوگی۔ ہماری اکثریت اللہ کی غلامی کے بجائے صرف ملازمت کرتی ہے' جو درحقیقت ہماری اپنی مرضی کے

مطابق ہوتی ہے‘ اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں۔ عبداللہ کے مفہوم کو ’’صِبغَۃُ اللّٰہ‘‘ بھی کہا جا سکتا ہے‘ یعنی اللہ کا رنگ۔ جیسا اللہ چاہتے ہیں ویسی خواہشات‘ ویسی سوچ‘ ویسا عمل اور ویسا ہی اخلاق ہو تو عبداللہ بنتا ہے اور تادم آخر اسی رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کا نام عبدیت ہے۔

عبدیت کی کامل تصویر نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ آپؐ پہلے اللہ کے ’’عبد‘‘ اور پھر ’’رسول‘‘ ہیں‘ یعنی غلامی کے سانچے میں پوری طرح فٹ آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا۔ اصل عبدیت وہی ہے جس کا اظہار قولاً‘ عملاً‘ اخلاقاً‘ بین الخوف والرّجاء‘ اور کثرت سے گریہ وزاری کر کے‘ راتوں کو اللہ کے حضور کھڑے ہو کے‘ اور دن کے اوقات میں اللہ کے نظام کو نافذ کرنے کی جِدّوجُہد میں اور جہاد فی سبیل اللہ کر کے ہوتا ہے ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

جبکہ ہم نے اللہ کی غلامی کے بجائے اس کی ملازمت اختیار کی ہے‘ یعنی کچھ عمل اللہ کے احکام کے مطابق کر لیا‘ کچھ من مانی کر لی۔ یہ دورنگی ہے‘ حالانکہ عبدیت میں ملاوٹ اللہ کو بالکل پسند نہیں ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے‘ حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

بندوں کا اللہ پر حق

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس) ’’اسی طرح ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اہل ایمان کو نجات دیں‘‘۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الروم) ’’اور اسی طرح ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اہلِ ایمان کی مدد کریں۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے یہ حق اپنے اوپر عائد کیا ہوا ہے۔ اگرچہ اللہ پر کوئی بھی چیز لازم نہیں کی جا سکتی‘ لیکن یہاں ’’حَقًّا عَلَيْنَا‘‘ سے یہی مراد ہے کہ اہلِ ایمان کی مدد و نصرت اللہ نے اپنے اوپر لازم کی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بصیرت اور سماعت بہت گہری ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون اس کے حق میں دنیا میں گواہی دے رہا ہے ع ’’دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!‘‘ تو اس کے لیے اللہ نے مدد کا وعدہ کیا ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) ’’اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا‘‘۔ لیکن اگر ہم نے اللہ کا حق ادا نہ کیا یا عبدیت میں اپنے آپ کو نہ ڈھالا‘ زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزاری اور اللہ کو بس صرف عبادات (نماز‘ روزہ‘

حج‘ زکوٰۃ) تک محدود رکھا تو پھر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ میزانِ عدل وقسط قائم کرے گا‘ اور جس نے کسی کا ایک رائی کے دانے کے برابر بھی حق مارا ہو گا تو اللہ اُس کو وہ حق دلائے گا۔ سورۃ الانبیاء میں ذکر ہے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ﴾ (آیت ۴۷)

’’اور قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو کو لا رکھیں گے اور پھر کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اور اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو ہم اس کو سامنے لے آئیں گے۔‘‘

مندرجہ بالا آیات کے مطابق ’’نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ‘‘ اور ’’نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ‘‘ کی بشارت دنیا میں بھی ہے‘ لیکن آخرت میں اس کا بھرپور اظہار ہو گا جب اللہ کی صفت عدل ظاہر ہو گی۔

جب انسان اللہ کی بندگی میں لگ جاتا ہے‘ حقوق کی ادائیگی عبدیت سے‘ انتہائی محبت اور عاجزی سے کرتا ہے اور ہر قسم کے شرک سے بچنے کے لیے تن من دھن یعنی اپنی جسمانی و ذہنی صلاحیتیں اور اپنی مالی طاقتیں اپنے دل کی خوشی سے اللہ کی راہ میں لگا دیتا ہے اور اس میں اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیتا ہے کہ ؎

جان دی‘ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

تو اللہ بھی اپنے بندے کے حق میں نجاتِ اخروی اور دوزخ کی آگ سے نجات کا پروانہ دے دیتا ہے ع ’’یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے!‘‘ —— ہم اللہ کی بندگی میں کیسے لگیں؟ اس کے لیے والدِ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ’’توحید عملی‘‘ کا مطالعہ مفید رہے گا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ حق بات پر میری رہنمائی فرمائے اور اپنے فرائض کو احسن طریقے سے ادا کرنا میرا اوّلین نصب العین بنا دے اور پڑھنے والوں کو حق سمجھ کر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین!) اس لیے کہ یہ میرا نہیں بلکہ اللہ کا حکم ہے اور اگر ہم اس کو سیدھا رکھیں گے تو ہم سیدھے رہیں گے اور اس کو ٹیڑھا کر دیں گے تو ہم خود ٹیڑھے ہو جائیں گے‘ جیسا کہ آج پورے معاشرے میں ہر خاندان میں نظر آ رہا ہے۔

❁❁❁

کلامِ اقبال ۔ قرآن کے ترازو میں (۴)

پروفیسر عبداللہ شاہین

اقبال کا تصوّرِ ابلیس

''جاوید نامہ' کے علاوہ ''بالِ جبریل'' میں بھی ''اقبالی ابلیس'' اور ''جبریلؑ'' کا خیالی مکالمہ موجود ہے۔ جبرئیل (علیہ السلام) ابلیس کی حالت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ع

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو

کہ ے

کھو دیے انکار سے تُو نے مقاماتِ بلند

مگر ''ابلیس'' کسی پشیمانی کا اظہار کرنے کی بجائے جواب دیتا ہے:

آہ! اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کرگیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!

پھر بڑے فخر سے کہتا ہے: ع

میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پُو!

اور ع

میرے طوفاں یم بہ یم' دریا بہ دریا' جُو بہ جُو!

مزید برآں لاف زنی کرتا ہے کہ: ے

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تُو؟

آخر میں جبرئیل (علیہ السلام) کا استخفاف کرتے ہوئے احساسِ برتری میں یوں اِتراتا ہے: ے

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تُو فقط اللہ ھُو' اللہ ھُو' اللہ ھُو!

یعنی وہ جبرئیل (علیہ السلام) کو محض ''اطاعت گزار'' اور بے چون و چرا تابع فرمان ہونے کی وجہ سے

لذتِ آرزو سے محروم سمجھتا ہے اور اپنی کارگزاریوں پر فخر کرتے ہوئے استکبار میں تعلّی کُناں ہے۔ گویا اللہ عزوجل کے حضور سرافگندہ' تسلیم کنندہ اور سراپا نیاز بننا کوئی ادنیٰ درجہ کا عمل ہے اور اسے جبریلؑ ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے'' کے وصف کی بنا پر کمتر و مسبوق نظر آتا ہے۔ حالانکہ اللہ ذوالجلال والاکرام کی بارگاہِ عالیہ میں جی حضوری ('yes, my lord!') شہنشاہِ کائنات کی ہاں میں ہاں ملانا اور مَلِکُ المَلِیک کی شان میں رطبُ اللّسان رہنا چوٹی کا عمل ہے۔

قرآن مجید میں دو جگہ ملتے جلتے الفاظ میں اللہ مالک الملک نے اپنے ایسے ذاکرین بندوں کی یوں تعریف کی ہے:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾

(الانعام:۵۲)

''(اے نبی ﷺ اپنی مجلس سے) جدا نہ کیجیے گا (میرے) ان (ذاکرین بندوں) کو جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام' وہ چاہتے ہیں (فقط) اُس کے رخ زیبا (کا دیدار)۔''

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ﴾ (الکہف:۲۸)

''(اے نبی ﷺ!) مجلس آرا رہیے (میرے) ان (بندوں) کے ساتھ' جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام' چاہتے ہیں (صرف) اُس (الجمیل) کے سوہنے مکھڑے (کی دید) اور آپ کی نظر (محبت) ان سے نہ ہٹے۔''

الغرض اللہ کا ذکر اور اس کی یاد میں محو رہنا تو بہت بڑا اور انتہائی پسندیدہ عمل ہے۔ اللہ کے نبی سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ' جو تمام جہانوں اور تمام جن و انس کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں' آپ ﷺ کا محبوب و مرغوب شغل (مصروفیت) بھی ذکرِ دوام تھا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ((کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ))(۱) —— اور اُمتیوں کو بھی یہی ارشاد فرمایا:

((لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ))(۲)

''تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب هل یتتبع المؤذن فاه ههنا وههنا...... وصحیح مسلم' کتاب الحیض' باب ذکر اللہ تعالی فی حال الجنابة وغیرها۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب الدعوات' باب ما جاء فی فضل الذکر۔

نماز بذاتِ خود ذکر الٰہی کی اعلیٰ ترین شکل ہے' جس میں افضل الذکر یعنی کلام اللہ کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اللہ' ملک الملوک کے حضور قیام' رکوع اور سجود بھی شامل ہے۔ اس کے باوجود مسجودِ کائنات نے فرمایا:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ﴾

(النساء:۱۰۳)

یعنی نمازوں کی ادائیگی کے مابعد اوقات میں بھی چلتے پھرتے' بیٹھے اور لیٹے ہر حالت میں اللہ کا ذکر جاری وساری رکھا کرو۔ نیز فرمایا کہ تم مبلغ ہو یا مجاہد' بے شک فرعون جیسے طاغوتی حکمرانوں اور میرے باغیوں تک میرا پیغامِ توحید پہنچا رہے ہو' مگر اعلائے کلمۃ الحق کے ہمراہ ﴿وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾﴾ (طٰہٰ) ''میرے ذکر دوام میں سستی نہ کرنا''۔ اسی طرح اگر معرکۂ رزم گرم ہو اور کارزارِ ہستی میں نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر سبیل الجہاد میں برسرِ پیکار ہو' تو بھی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾

(الانفال:۴۵)

یعنی دشمنانِ دین سے مڈبھیڑ میں ڈٹے رہنے کے ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر کثرت سے جاری رہے۔

مختصر یہ کہ تم عابد ہو یا زاہد' غازی ہو یا مجاہد' تاجر ہو یا ملازم' آجر ہو یا مستأجر' تمہاری کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ ''ہتھ کار ولے' دل یار ولے'' ع ''ہزار کام ہوں لیکن زبان ہو دل کی رفیق''۔ بحوالہ عبارتِ قرآنی:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾ (الجمعة)

یعنی مراسمِ عبودیت ادا کرنے کے بعد روئے زمین میں رزقِ حلال تلاش کرنے کے لیے پھیل جایا کرو اور ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر کثرت سے جاری رکھا کرو تاکہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جاؤ۔

آمدم برسرِ مطلب' جبرئیلؑ اس کی باتوں پر برہم ہونے کی بجائے' اسے بڑی نرمی سے (politely) ''ہمدمِ دیرینہ'' کے تخاطب سے اللہ تعالیٰ کے حضور ''توبہ'' کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں: ع

کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟

مگر وہ ضدی ٹکا سا جواب دیتا ہے کہ ہرگز نہیں ؎

اب یہاں میری گزر ممکن نہیں' ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کُو!

یہاں یہ نکتہ زیرِ بحث لانا بے جا نہ ہوگا جس کا اظہار خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکرِ اقبال'' میں کیا ہے۔ بقولہ:

''ابلیس کے تصور میں ایسے صفات موجود ہیں جو قلبِ ماہیت سے 'خودی' کی تکمیل میں معاون ہو سکتے ہیں اور ابلیس کی ستائش انہی صفات کی وجہ سے ہے جن میں زندگی کا ارتقا مضمر ہے اور ان صفات کے فقدان سے زندگی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہ وہی بات ہے جو حدیث شریف میں کہی گئی ہے کہ شیطان کی گردن مارنے کی ضرورت نہیں' اسے مسلمان کرنے کی ضرورت ہے..... اقبال اس کو آتشِ حیات کہتا ہے' لیکن اس نار کو دُود آفرین نہیں بلکہ نور آفرین ہونا چاہیے۔''

تو تجزیۂ عرض ہے کہ اقبال کے نظریہ خودی پر تو بات ہو چکی ہے جس کی رو سے خودی تو ''خودشناسی اور نتیجتاً خداپرستی کا نام ہے'' اور ابلیس کی حقیقت ہے کہ وہ آتش نژاد جن ہے' جسے خدا کے حضور سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے تھا مگر وہ خوئے بے نیازی اور لاابالی پن سے بغاوت پر اتر آیا اور مدِمقابل بن بیٹھا۔ رہی ''مسلمان'' کرنے کی بات تو شیطان کیا خاک ''مسلمان'' ہوگا! وہ تو اتنا ''تیس مار خان'' اور ''پاٹے خان'' ہے کہ جبریل کے استفسار پر ہرگز تائب ہونے کے لیے تیار نہیں' بلکہ مزے کی بات یہ ہے کہ خود اقبال جب اس ''خواجۂ اہلِ فراق'' کو رجوع الی اللہ کی دعوت دیتا ہے تو وہ عجب کیف کے عالم میں صاف انکار کر دیتا ہے ؎

گفت ''سازِ زندگی' سوزِ فراق
اے خوشا سرمستیٔ روزِ فراق!
بر لبم از وصل می ناید سخن
وصل اگر خواہم نہ او ماند نہ من''

وہ توع ''خضر بھی بے دست و پا' الیاس بھی بے دست و پا'' کہہ کر اولیاء و انبیاء کا استخفاف بھی کرتا ہے۔

پھر جس حدیث رسولؐ کا موصوف عبدالحکیم صاحب حوالہ دے رہے ہیں اس کا متن کچھ یوں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِيْنُهٗ مِنَ

الْمَلَائِكَةِ۔ قَالُوْا: وَاِيَّاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: وَاِيَّایَ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِیْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَيْرٍ))(۱)

''تم میں سے ہر کسی کے ساتھ ایک ساتھی جنّات میں سے اور ایک ساتھی فرشتوں میں سے مقرر کیا گیا ہے''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ کے ساتھ بھی؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں میرے ساتھ بھی، لیکن اللہ نے اُس (شیطان) کے خلاف میری مدد فرمائی ہے تو وہ مسلمان (تابع فرمان) ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ مجھے صرف خیر ہی کی ترغیب دیتا ہے۔''

حدیث میں وارد لفظ ''فاسلم'' کو ''فَاَسْلَمُ'' (میم کی پیش کے ساتھ) بھی پڑھا گیا ہے اور ''فَاَسْلَمَ'' (میم کی زبر کے ساتھ) بھی۔ مقدم الذکر صورت میں یہ فعل مضارع کا صیغہ واحد متکلم ہے، جبکہ مؤخر الذکر صورت میں فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ چنانچہ متنِ حدیث کے مطابق آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ: ''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِیْ عَلَيْهِ'' لیکن اللہ تعالیٰ اس جن کے مقابل میری مدد فرماتا ہے: ''فَاَسْلَمُ'' پس میں محفوظ و سلامت رہتا ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ میں اسے مسلمان (تابع فرمان) کر لیتا ہوں، بلکہ یہ کہ میں اس کی شرارت سے بعونِ اللہ عزوجل سلامتی میں رہتا ہوں۔ پیش نظر رہے کہ یہ ذُرّیتِ ابلیس میں سے ایک عام جن کی بات ہے، ابلیس کی ذات کا تذکرہ نہیں۔ اور اگر جن کے مسلمان ہونے (یعنی تابع فرمان بن جانے) کی تاویل بھی کی جائے تو ذُرّیتِ ابلیس میں سے صالح اور مسلمان جن بھی ہیں اور غیر صالح و گنہگار بھی ہیں۔ بحوالہ آیاتِ قرآنی:

﴿وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ﴾ (الجن)

''اور یہ کہ ہم میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ اور طرح کے ہیں۔ غرض ہم بھی مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ (اب) ہم نے سمجھ لیا کہ نہ تو ہم زمین میں (رہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب صفة القيامة والجنة والنار۔ باب تحريش الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس وان مع كل انسان قريناً۔

کر) اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ (کسی طرف) بھاگ کر اُس کو ہرا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت کی بات سنی تو اُس پر ایمان لے آئے۔ پس جو شخص اپنے رب پر ایمان لائے گا اسے نہ کسی نقصان کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی طرح کے زُور و ظلم کا۔ اور یہ کہ ہم میں سے کچھ تو مسلمان (ہو گئے) ہیں اور کچھ (بدستور سابق) بے راہ ہیں۔''

نیز متذکرہ بالا حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری شارح ''مشکوٰۃ المصابیح'' اپنی کتاب ''مرقاۃ'' میں رقم طراز ہیں:

"فی جامع الترمذی قال ابن عيينه : فاسلم بالضم، ای اسلم انا منه والشيطان لا يسلم"

یعنی لفظ ''اسلم'' کی میم پر پیش (فعل مضارع، صیغہ واحد متکلم) ہے تو معنی ہے میں اس سے سلامتی میں رہتا ہوں، نہ کہ شیطان مسلمان ہو جاتا ہے اور اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے— لیکن اگر لفظ ''اسلم'' کی میم پر زبر پڑھی جائے (فعل ماضی، صیغہ واحد مذکر غائب) تو بھی عبارت حدیث ''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِیْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَيْرٍ'' کا معنی ہوگا ''لیکن اللہ نے اُس (شیطان) کے مقابل میری مدد فرمائی ہے، وہ میرا تابع ہو گیا ہے اور مجھ خیر ہی کی ترغیب دیتا ہے، وہ مجھے شر کی ترغیب نہیں دے سکتا''۔ اس صورت میں یہ آپ ﷺ کی تخصیص ہے، جیسا کہ صاحب مرقاۃ نے لکھا ہے:

"وفی جامع الدارمی قال ابو محمد : اسلم بالفتح ای استسلم وذل وانقاد ..... قال النور بشتی : اللّٰه تعالی قادر علی كل شیء فلا يستبعد من فضله ان يخص نبيه بهذ الكرامة اعنی اسلام قرينه" (۱)

الغرض رسول اللہ ﷺ نے شیطان سے محفوظ رہنے اور اس کے اطاعت شعار ہو جانے کا صرف اپنا تخصّص بیان کیا ہے، وگرنہ فرما دیتے: اے میرے صحابہ! تم بھی شیطان کو مسلمان بنا کر اس سے محفوظ رہ سکتے اور اچھے کام لے سکتے ہو☆۔ چنانچہ یہ صرف پیغمبر اسلام ﷺ یا تمام انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ معصوم و مامون ہوتے ہیں، وگرنہ غیر نبی کوئی بھی شیطان سے محفوظ نہیں، جس کا ثبوت سورۃ الکہف میں قصہ خضر و موسیٰ علیہما السلام کے دوران میں ملتا ہے، جب شیطان نے موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد خاص جناب یوشع بن نون کو بھنی ہوئی مچھلی کا زندہ ہو کر

(۱) مرقاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح، ج ۱ ص ۱۳۸، مكتبه امداديه، ملتان۔

☆ ''جیسا کہ شیطان کی تحسین و تعریف کرنے والے فلسفیوں کا خیال ہے۔''

دریا میں کود جانا' موسیٰ علیہ السلام کے گوش گزار کرنا بھلا دیا۔ بحوالہ عبارتِ قرآنی: ﴿فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ﴾ (الکھف:٦٣) ——لیکن بقول خلیفہ عبدالحکیم ''اقبال کے ہاں ابلیس کا تصور اس کے فلسفۂ خودی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اقبال نے شیطان کی خودی کو بھی زور شور سے پیش کیا ہے' جس کی ماہیت آرزو' جستجو اور اضطراب ہے۔ اور کئی اشعار میں تو شیطان کی تذلیل کے بجائے اس کی تکریم کا پہلو غالب نظر آتا ہے''—— مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان میں ''خودی'' کہاں سے آ گئی!-- ''خودی'' تو اپنی ''حقیقت'' کو پہچاننے کا نام ہے اور اقبال کا فلسفۂ خودی قرآن سے ماخوذ ہے۔

سید نذیر نیازی نے ایک دفعہ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو بتایا تھا کہ میں نے علامہ اقبال سے ان کے فلسفۂ خودی کا ماخذ جاننا چاہا۔ انہوں نے فرمایا کل آنا! میں اگلے دن کاپی پنسل لے کر بڑے ذوق وشوق سے کشاں کشاں ان کے درِدولت پر پہنچا۔ آپ نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور فرمانے لگے: میں تمہیں اپنے نظریۂ خودی کا ماخذ بتاتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ابھی آپ فلسفہ (philosophy) کی کچھ ضخیم کتابیں اٹھا کر لائیں گے اور نشاندہی فرمائیں گے۔ مگر کہنے لگے: جاؤ! اندر سے قرآن حکیم اٹھا لاؤ! میرے (اشتیاق وتجسّس کے) جذبات پر اوس پڑ گئی۔ پھر آپ نے سورۃ الحشر کی یہ آیت نکالی ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ ''اور تم ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے اللہ کی ہستی کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان (غافلین) کو ان کی اپنی ہستی کے شعور سے بے بہرہ کر دیا''۔ پھر فرمانے لگے: میں نے اپنا فلسفۂ ''خودی'' اس آیۂ مبارکہ سے اخذ کیا ہے۔ گویا اصل فلسفۂ خودی ہے: ((مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ)) ''جس نے اس کائنات میں اپنے مقام ومرتبہ کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

ابلیس اپنی بابت جو تعلّی' تفاخر اور تکبر جیسی صفات بیان کرتا ہے ان کا ''خودی'' سے کیا تعلق؟ ''خودی'' خود پسندی' عُجب' انانیت' استکبار' نخوت' تمکنت' غرور' تکبر اور گھمنڈ کا نام تو نہیں' یہ تو ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' کا نام ہے۔ انگریزی لفظ Ego عربی میں ''أنا'' اور اردو میں ''میں'' بھی خودی نہیں بلکہ ''میں'' جو ''اکڑ'' کو پیدا کرتی ہے اسے مارنا اور ختم کرنا مقصود ہے ؏ ''بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا!''

''گردن فرازانِ جہاں'' خود دار نہیں متکبّر ہوتے ہیں اور پھل ہمیشہ جھکی ہوئی ٹہنی کو لگتا ہے۔ بقول شاعر ؏ ''اپنی خودی پہچان' اے غافل ''انسان''!

آہ! ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنہیں حاصل نہیں

''خودی'' تو اللہ ذوالجلال والاکرام کے حضور ''انکسار'' اور ''غیر اللہ'' کے مقابل ''وقار'' کا نام ہے۔ بحوالۂ حدیث ((اُطْلُبُوا الْحَوَائِجَ بِعِزَّةِ الْاَنْفُسِ فَاِنَّ الْاُمُوْرَ تَجْرِیْ بِالْمَقَادِیْرِ))(۱) ''اپنی حاجات عزتِ نفس کے ساتھ طلب کرو! بے شک تمام کام اللہ کی مقرر کی ہوئی تقدیر سے طے پاتے ہیں۔''

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگر اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہوتے اور ان کے ہاتھ سے کوڑا یا چھڑی گر جاتی تو کبھی کسی سے پکڑانے کی استدعا نہ کرتے' بلکہ سواری سے اتر کر خود پکڑتے' کیونکہ غیر اللہ سے سوال کے باعث خودی مجروح وضعیف ہوتی ہے۔ خودی کا اصول تو یہ ہے کہ: ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

خودی کی تلوار تو تیز ہی الاّ اللہ کی سان پر ہوتی ہے' مگر ابلیس تو ''اللہ'' کے ''الا اللہ'' ہونے سے ہی انکاری ہے۔ تبھی تو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے (surrender) کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بلا شبہ اقبال جِدّ وجُہد کا مبلغ شاعر ہے وہ حرکت وعمل' سعی وپیہم' جہدِ مسلسل کا قائل اور پیامبر ہے۔ یہ نظریہ اس حد تک تو درست ہے کہ۔ ؎

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

کیونکہ اس طرح وسعتِ نظر اور جستجو وحصولِ نصب العین میں بقول حالی: ؎

''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں!''

کی کیفیت جاری وطاری رہتی ہے۔ یہ نہیں کہ صلاحیتوں کو منفیت پر لگانے اور کھپانے پر بھی تحسین شروع ہو جائے۔ بقول غالب: ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی!

کہ شیطان اگر ''خدا پرستی وانسان دوستی'' کے بجائے نفس پرستی اور خدا و جبریلؑ و آدمؑ کی دشمنی

(۱) ضعیف الجامع الصغیر للالبانی' ح ۹۰۱۔ وسلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ' ح ۱۳۹۰۔

میں جولانیاں دکھانے لگے تو اس کی پیٹھ ٹھونکنا شروع کر دی جائے۔ کیا مقامِ تعجب نہیں کہ اقبال نے ابلیس کے لیے: ''آں سراپا سوز و آں خونین ایاق — رِند و مُلّا و حکیم و خرقہ پوش — ''تا نصیب از دردِ آدم داشتم ' — ''در عمل چوں زاہدانِ سخت کوش'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں! یعنی وہ سراپا درد و سوز اور اس قدر غم گسار ہے کہ آدمؑ کی خاطر اپنی آرزوؤں کا خون کر کے خدا سے دائمی جدائی اختیار کر لی ہے۔ وہ رند بھی دکھائی دیتا ہے اور ملا بھی۔ حکیم نکتہ رس بھی ہے اور صوفی خرقہ پوش بھی۔ وہ زاہدوں کی طرح عمل میں بھی سخت کوش ہے کہ (انکارِ سجدہ اور اغوائے انسانی کا) جو نظریہ اختیار کر لیا ہے اس پر بڑی جانفشانی سے عمل پیرا ہے' یعنی اس کے ثبات کی داد دیجیے کہ آج تک متزلزل نہیں ہوا۔ بے شمار پیغمبروں کو دیکھ چکا ہے لیکن کافر کا کافر ہے[1] گویا بقول خلیفہ عبدالحکیم اقبال کے دل میں اس ''کافر ثابت قدم'' کے لیے بہت ہمدردی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نرم گوشہ یہ اختیار کیا ہے کہ ''ڈھٹائی'' پر اس کی ''ہلاشیری'' کی ہے۔ بزبان اشعار ؎

اندکے در وارداتِ او نگر
مشکلات او ثباتِ او نگر!
غرق اندر رزمِ خیر و شر ہنوز
صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز!

مگر یہ تو وہی غالب والی بات ہوئی: ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

حالانکہ کفر پر اڑے رہنا کوئی مثبت صفت تو نہیں ہے۔ ابوجہل کی شخصیت ہی کو لیجیے جو سب کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ وہ کوئی تھڑدلا آدمی تو نہیں تھا' بلکہ کفار و مشرکین کا سُورویر اور مکہ کا ''سُورما'' تھا۔ چنانچہ جب میدانِ بدر کے مقتل میں اس کی گردن اتاری جانے لگی تو دھڑلے سے

(۱) اس کا جواب تو بہت پہلے ایک شاعر بصورت لطیفہ دے چکا ہے کہ ؎

خرِ عیسیٰؑ اگر بمکہ رَوَد چوں بآید ہنوز خر باشد

''اگر عیسیٰ علیہ السلام کا گدھا بھی مکہ چلا جائے تو جب بھی آئے گا گدھے کا گدھا ہی ہوگا۔''

اور قرآن مجید کا تو کیا ہی کہنا کہ ایسے ''ملا و حکیم و صوفی'' کی تمثیل میں فرمایا:

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعۃ:۵)

کہنے لگا کہ میری گردن ذرا نیچے سے اتارنا تاکہ پتا چلے کسی ''سردار کا سر'' ہے۔ تو کیا اس کا اس قدر جری ہونا کوئی کریڈٹ (credit) ہے؟ اسی طرح ابلیس کتنا ہی آفت کا پرکالا ہو' یعنی ع

''میرے طوفاں یم بہ یم' دریا بہ دریا' جُو بہ جُو''

وہ بہرحال ایک منفی کردار ہے' فتنہ پرور شخصیت کا حامل ہے۔ وہ خود تسلیم کرتا ہے ع

میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پُو

چنانچہ معاشرے کے جو بدقماش اور بدمعاش کردار ہوں' خواہ کتنے ہی سینہ تان کر گولیاں کھانے والے ہوں' قابلِ آفرین نہیں ہو سکتے' کیونکہ وہ شریر ہوتے ہیں' شریف النفس نہیں۔ ہر سا جھا ماجھا بدنام (notorious) تو ہوتا ہے' نامور (famous) نہیں۔ مگر اسے کیا! وہ تو اسی بات پر اتراتا ہے کہ ع

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا؟

دیکھیے ''جگا'' اس معاشرے کا ''مار دھاڑ'' کرنے والا مشہور کردار تھا۔ آج بھی لوگوں سے جو ''بھتہ'' وصول کیا جاتا ہے اسی کے نام سے منسوب ''جگا ٹیکس'' کہلاتا ہے اور عوام سے جبراً رقم ہتھیانے والے ہر ''ہتھ چھٹ'' دہشت گرد کو جگا کہا جاتا ہے' جو سب کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ لہٰذا ابلیس ایک غنڈہ کردار ہے۔ وہ سرفروش (gallant) نہیں' سرپھرا ہے۔ بہادر نہیں' بدمعاش ہے۔ جو خالق و مالک کے سامنے خم ٹھونک کر آ کھڑا ہوا۔ پس وہ یاس و نراجیت کا پُتلا ہے۔ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ مجھے ''تَقَنَّطُوْا'' ہی راس ہے۔ شیطان کو ''ابلیس'' کا صفاتی نام دیا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ ایک اسم بامسمّیٰ کردار ہے' جس کے معنی ہی ناامید ہو کر ہمت ہار بیٹھنا' آس توڑ دینا' اور مایوسی و نامرادی کی وجہ سے برافروختہ (desperate) ہو جانا ہے۔ نیز اس نام میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ یاس اور نامرادی (frustration) کی بنا پر اس کی زخمی ''انا'' اور ''تکبر'' اس قدر برانگیختہ ہو گیا کہ اب وہ ہر بازی کھیلنے اور ہر جرم کا ارتکاب کر گزرنے پر تُل گیا۔ بفحوائے عبارت قرآنی:

﴿..... لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ﴾ (الاعراف)

''.....تو میں لازماً تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا ان (آدم و بنی آدم) کو (صراطِ مستقیم سے) پھسلانے کے لیے۔ نیز ان پر حملہ آور ہوں گا اُن کے آگے سے' پیچھے سے' دائیں

سے اور بائیں سے (یعنی تمام اطراف سے)۔''

وہ تو اس حد تک ''بدظن شخصیت'' کا حامل ہے کہ اپنی انکار کی روش اور گمراہی کو ''بِمَا اَغْوَيْتَنِيْ'' کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتا ہے' بلکہ آدمؑ کو بھی رب تعالیٰ سے بدگمان کرنے کے لیے کہتا ہے:

..... Who forfids thy use
conceals from us, naming
thee the tree
of knowledge, knowledge
both of good and evil;
Forbids us then to taste,
.....
In plain then, what forbids
he but to know,
Forbids us good, forbids us
to be wise?

(Paradise Lost Book-IX verses750-760)

(Paraphrase of the above verses in simple English:
Still God has forbidden its taste to us,..... that knowledge
of good will come to us, which, ...in plain words,.....
God forbids to have knowledge ..... thus he forbids us to
be good and wise.)

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو آدم (علیہ السلام) کو تو فضیلت ہی علم کی بنیاد پر دی اور اس حد تک علم عطا فرمایا کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ: ۳۱) نیز نیکی و بدی کی پہچان تو اس کی فطرت میں رکھ دی ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس) لیکن اقبال بھی غالباً مغربی مفکرین کی قبیح آراء کو فکرِ صحیح و صبیح سمجھ کر اس سے متاثر ہو گئے اور ''ابلیس'' کی دہشت گردی' فتنہ انگیزی اور سیاہکاری کو اس کی شاہکاری قرار دینے پر آمادہ ہو گئے اور اسے ''حرکت و عمل'' کا پیکر اور علامت (symbol) گردانتے ہوئے اس کی تحسین و تکریم پر اتر آئے۔ حالانکہ اس کی تمام تر ''کارگزاری'' فتنہ سامانیوں اور شر انگیزیوں پر مبنی ہے۔ وہ سراپا منفیت ہے' اُس میں مُثبیت کا شمہ بھی نہیں۔ وہ ایک اسم بامسمیٰ کردار ہے' ابلیس اس کا صفاتی نام ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس فرد ہے۔

الغرض ــــ ''ابلیس'' کے بارے میں اقبال کی قطعی اور حتمی رائے ان کی آخری کتاب

''ارمغانِ حجاز'' میں ان کی شہرۂ آفاق نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں سامنے آتی ہے' اور بمصداق ع ''مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات'' ان کا اصل موقف بھی یہی ہے' جس میں انہوں نے ''اَلْغَرُوْرُ'' (بڑا دھوکہ باز) ابلیس کے نت نئے گرگٹ نما بہروپ ﴿وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۱۴﴾ (الحدید) کے بخیے ادھیڑ دیے ہیں' اور بحوالہ آیت قرآنی ﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵﴾ (فاطر) کا حق ادا کرتے ہوئے اس کا اصل مکارانہ روپ بے نقاب کر دیا ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا یہ رائے کا تضاد نہیں ہے؟ تو اس کا جواب اور مثال یہ ہے کہ اقبال پہلے پہل مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے' مگر بعد ازاں آپ اس کے ناقدین میں شامل ہو گئے۔ کسی نے پوچھا' یہ کیا؟ پہلے آپ کچھ اور کہتے تھے' اب کچھ اور کہنے لگ گئے ہیں! فرمایا: صرف پتھر ہیں جو تبدیل نہیں ہوتے (only stones do not change) انسانی رائے تو بدلتی رہتی ہے۔ جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا ہے' خیالات اور آراء تبدیل ہوتی ہیں۔ پہلے میں وہ کہتا تھا اب میری یہ رائے ہے۔

بہر حال ملاحظہ فرمائیے! ابلیس کا اصل روپ اور کردار!

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
ہے مرے دستِ تصرّف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں' کیا مہر و مہ' کیا آسمانِ تو بتو
کیا امامانِ سیاست' کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو!
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ ہُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو (۱)

(۱) تہجد گزار بندے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا ''شرعِ پیغمبر'' کہیں
الحذر! ''آئینِ پیغمبر'' سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن' مرد آزما' مرد آفریں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مؤمن ہے محرومِ یقین!
ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

دیکھئے! بقول اقبال' کس طرح ابلیس تسلیم کرتا ہے کہ دنیا میں زمیں تا بہ فلک جتنے بھی فتنے ہیں' وہ اسی گھن چکر کے چلائے ہوئے چکر ہیں۔ اور جتنے بھی سیاسی' معاشی و معاشرتی باطل نظام ہیں وہ اسی کے سکھائے پڑھائے ہوئے ہیں۔ دیر و کلیسا میں غیر اللہ کی پرستش اسی کا پھونکا ہوا فسوں (جادو) ہے۔ دنیا میں ملوکیت اور جمہوریت کا جال بھی اسی کا پھیلایا ہوا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کا جنوں بھی اسی کی آشفتہ سری ہے۔ البتہ اسے خطرہ ہے تو ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ سے ہے اور خوف ہے تو ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ سے ہے۔ چونکہ اسلام چند مراسم عبودیت کا نام نہیں' بلکہ روحانی' سیاسی' معاشی اور معاشرتی تمام پہلوؤں پر مبنی اکمل و اتم نظام کا نام ہے' جس میں عبادات کا روحانی پہلو ہے تو ''اشکِ سحرگاہی سے وضو'' اور ''یورپ کی زمستانی ہوا میں بھی آدابِ سحرگاہی نہ چھوٹنے'' والا' فرائض سے نوافل تک کی ادائیگی کا نظام ہے۔ معاشرتی پہلو ہے' تو زن و مرد کے حقوق و فرائض کا تعین اور ان کی باہمی ادائیگی کا منصفانہ نظام ہے کہ عورت کے حقوق' مرد کے فرائض ہیں اور مرد کے حقوق عورت کے فرائض ہیں' جن کی باہمی ادائیگی سے توازن قائم رہتا ہے۔ معاشی نظام ہے تو ایسا

جو خوشحال لوگوں کو دولت کا امین بناتا اور زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی کے ذریعے ان کے مال کو خالص مالِ حلال بناتا ہے۔ اس کے لیے اس نے ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) کا سنہری اصول دیا تاکہ گردشِ دولت عوام تک ہو اور چند مخصوص امراء کے درمیان ہی نہ گھومتی رہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سرمایہ معاشرے میں یوں گردش کرے جیسے رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ وہ نظام جس میں چند سرمایہ دار افراد بے زمام اور بے مہار کھل کھیلتے ہوں اور معاشرے کا خون چوستے ہوں' اسلام اسے باطل نظام قرار دیتا ہے۔ جس کا سیاسی نظام ''اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ'' ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جناب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تک جسے بھی حکمرانی پیش کی گئی اس نے خلافت و حکومت کو اعزاز کی بجائے ذمہ داری سمجھتے ہوئے اولاً یہ بوجھ اٹھانے سے احتراز کیا۔ اور جب شورائیت کے نتیجہ میں یہ امانت سنبھالی تو عوام کے حکمران بننے کی بجائے ان کے خادم بن کر اس کا حق ادا کر دیا۔ لہٰذا ابلیس چاہتا ہے کہ ''شرعِ پیغمبر اسلام'' کی تفصیلات عوام الناس پر آشکارا نہ ہو جائیں' بلکہ حاملِ قرآن مسلمان مسائل نظری میں ہی الجھا رہے۔ خلقِ قرآن' نزولِ مسیحؑ' آمدِ مہدی کے مباحث میں کھویا رہے تاکہ عملی طور پر صاحب کردار نہ بن جائے۔ بس چند مراسمِ عبودیت ادا کر لیا کرے اور اسی کو نجات کے لیے کافی سمجھ کر تکیہ کناں ہو جائے —— یہ ہیں ابلیس کی شاطرانہ چالیں' جن سے ہمیں ہر وقت چوکس و چوکنا رہنا چاہیے اور اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے قرآنی تعلیمات کو مکمل طور پر اپنانا چاہیے۔

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 15 روپے

مولانا وحید الدین خان

اپنے الفاظ کے آئینے میں (۳)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

اس سلسلہ وار مضمون کی سابقہ دو اقساط میں ہم نے مولانا وحید الدین خان صاحب کے تصورِ مہدی و مسیح اور نظریہ دجال کا تجزیاتی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ ذیل کی قسط میں ہم علاماتِ قیامت کے باب میں دیگر علامات مثلاً یاجوج ماجوج، دابۃ الارض، دریائے فرات سے سونے کا خزانہ برآمد ہونا، دخان، اللہ کے کلمہ کا غالب ہونا، بیت اللہ کو آگ لگایا جانا اور وقوعِ قیامت کے حوالہ سے خان صاحب کے نقطہ نظر کا ایک تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

یاجوج و ماجوج کی حقیقت

مولانا وحید الدین خان صاحب نے یاجوج و ماجوج سے مراد سدِّ ذوالقرنین کے پیچھے مقید وحشی قبائل کی بجائے یورپی اور مغربی اقوام لی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یاجوج اور ماجوج سے کون لوگ مراد ہیں، اس کے بارے میں اہلِ علم نے مختلف رائیں دی ہیں۔ مجھے ذاتی طور اس معاملے میں مولانا انور شاہ کشمیری (وفات: ۱۹۳۴) کی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے روس اور برطانیہ اور جرمنی کی قوموں کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ، مئی ۲۰۱۰ء، ص ۳)

ایک اور جگہ اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت میں لکھتے ہیں:

''یاجوج اور ماجوج کے بارے میں جو دستیاب معلومات ہیں، وہ سب سے زیادہ یورپی قوموں پر صادق آتی ہیں۔ یہ معلومات زیادہ تر تمثیل کی زبان میں ہیں، اس لیے لوگوں کو ان کا مفہوم سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اگر اس حقیقت کو ملحوظ رکھا جائے تو تقریباً بلا اشتباہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج سے مراد وہی قومیں ہیں جن کو یورپی قومیں کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ لوگ غالباً پہلے مغربی یورپ میں آباد ہوئے، پھر انھیں کی نسلیں امریکا اور آسٹریلیا میں پھیل گئیں۔'' (ماہنامہ الرسالہ، مئی ۲۰۱۰ء، ص ۴)

خان صاحب نے یاجوج و ماجوج کو دو ادوار میں تقسیم کیا۔ ان کے نزدیک پہلے دور میں یہ ایک غیر مہذب، جنگجو اور اجڈ قوم تھی جبکہ اپنے دوسرے یا موجودہ دور میں یہ مہذب اور ترقی یافتہ اقوام میں شامل ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قرآن میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ ذوالقرنین کے حوالے سے (الکھف: ۹۴)، اور دوسری جگہ ذوالقرنین کے بغیر (الانبیاء: ۹۶)۔ ان دونوں آیتوں کے مطالعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں آیتوں میں یاجوج اور ماجوج کے دو دوروں کا ذکر ہے، جو ایک کے بعد ایک پیش آئیں گے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نے جو دیوار بنائی تھی، وہ یاجوج اور ماجوج کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ دیوار ان کی مفسدانہ کاروائی کے لیے ایک روک بن گئی۔ ایک عرصے تک یہ صورت حال قائم رہی۔ اس کے بعد یاجوج اور ماجوج کی ابتدائی سرکش نسل ختم ہوگئی اور بعد کی نسل پیدا ہوئی جو نسبتاً معتدل نسل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس دوران ذوالقرنین کی بنائی ہوئی ابتدائی دیوار دھیرے دھیرے ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اس کے بعد یاجوج اور ماجوج کی اگلی نسلوں کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ دیوار سے باہر آئیں، اور دیوار کے باہر کی دنیا میں پھیل جائیں۔ یہی دوسرا زمانہ ہے جب کہ ان کے درمیان تہذیب کا دور شروع ہوا۔ یہ دور مختلف احوال کے درمیان بتدریج ترقی کی طرف بڑھتا رہا۔ یہ بعد کا دور دو زمانوں میں تقسیم ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے قبل کا زمانہ، اور نشاۃ ثانیہ کے بعد کا زمانہ۔'' (ماہنامہ الرسالہ، مئی ۲۰۱۰ء، ص ۴-۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''ذوالقرنین کے بنائے ہوئے مادی بند کے ٹوٹنے کے بعد جو واقعہ پیش آئے گا، اس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ﴾ (الکھف: ۹۹) یعنی قدیم محدود جغرافیہ سے نکل کر یاجوج اور ماجوج، لوگوں سے عمومی اختلاط کرنے لگیں گے۔ یہ گویا ان کا دورِ اختلاط ہوگا۔ اس کے بعد حدیث میں جس واقعے کا ذکر ہے، یعنی ان کا ہر چیز کو کھا جانا، اور ساری دنیا کے پانی کو پی جانا، اس سے مراد بعد کا وہ واقعہ ہے، جب کہ انھوں نے نیچر پر فتح حاصل کی اور جدید صنعتی دور پیدا کیا۔ اس جدید صنعتی دور کے نتیجے میں ان کو عالمی استحصال کا موقع ملا۔

قرآن سورۃ نمبر ۱۸ میں یاجوج اور ماجوج کے پہلے دور کا ذکر ہے‘ اور قرآن کی سورۃ نمبر ۲۱ میں یاجوج اور ماجوج کے دوسرے دور کا ذکر۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بظاہر یاجوج اور ماجوج کے تین بڑے دور ہیں۔ محصوریت کا دور‘ اختلاط کا دور‘ سائنس اور صنعتی ترقی کا دور۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۵)

یاجوج ماجوج کے بارے میں خان صاحب کا یہ نقطہ نظر بوجوہ غلط ہے:

خان صاحب کا یہ دعویٰ کہ یاجوج ماجوج جس دیوار کے پیچھے مقید تھے‘ وہ آہستہ آہستہ ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اور یاجوج ماجوج کا خروج ہوگیا ہے‘ درست نہیں ہے۔ کیونکہ روایات کے مطابق یاجوج ماجوج کا خروج‘ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوگا‘ اور ان کا خروج جس شان سے ہوگا‘ وہ ایک عام فرد کو بھی بغیر کسی تاویل یا غور وفکر کے‘ یہ بتلانے کے لیے کافی ہوگا کہ ان کا خروج ہو چکا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((اِذْ اَوْحَی اللّٰہُ اِلٰی عِیْسٰی اِنِّیْ قَدْ اَخْرَجْتُ عِبَادًا لِیْ لَا یَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِھِمْ‘ فَحَرِّزْ عِبَادِیْ اِلَی الطُّوْرِ‘ وَیَبْعَثُ اللّٰہُ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ‘ وَھُمْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ‘ فَیَمُرُّ اَوَائِلُھُمْ عَلٰی بُحَیْرَۃِ طَبَرِیَّۃَ‘ فَیَشْرَبُوْنَ مَا فِیْھَا‘ وَیَمُرُّ آخِرُھُمْ فَیَقُوْلُوْنَ :لَقَدْ کَانَ بِھٰذِہٖ مَرَّۃً مَاءٌ‘ وَیُحْصَرُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَاَصْحَابُہٗ حَتّٰی یَکُوْنَ رَاْسُ الثَّوْرِ لِاَحَدِھِمْ خَیْرًا مِنْ مِائَۃِ دِیْنَارٍ لِاَحَدِکُمُ الْیَوْمَ‘ فَیَرْغَبُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَاَصْحَابُہٗ‘ فَیُرْسِلُ اللّٰہُ عَلَیْھِمُ النَّغَفَ فِی رِقَابِھِمْ‘ فَیُصْبِحُوْنَ فَرْسٰی‘ کَمَوْتِ نَفْسٍ وَاحِدَۃٍ‘ ثُمَّ یَھْبِطُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَاَصْحَابُہٗ اِلَی الْاَرْضِ‘ فَلَایَجِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ اِلَّا مَلَاَہٗ زَھَمُھُمْ وَنَتْنُھُمْ‘ فَیَرْغَبُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَاَصْحَابُہٗ اِلَی اللّٰہِ فَیُرْسِلُ اللّٰہُ طَیْرًا کَاَعْنَاقِ الْبُخْتِ‘ فَتَحْمِلُھُمْ‘ فَتَطْرَحُھُمْ حَیْثُ شَاءَ اللّٰہُ))

(صحیح مسلم‘ کتاب الفتن وأشراط الساعۃ‘ باب ذکر الدجال وصفتہ وما معہ)

’’جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائیں گے کہ میں نے اب کی بار (آزمائش کے لیے) ایسے بندوں کو نکالا ہے کہ ان سے لڑنے کی طاقت کسی میں بھی نہیں ہے۔ پس آپ میرے بندوں (اہلِ ایمان) کو لے کر طور پر چلے جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ یاجوج وماجوج کو بھیجیں گے‘ اور وہ ہر ٹیلے سے پھسلتے چلیں آئیں گے۔ پس ان کے اگلے لوگ بحیرۂ طبریہ سے گزریں گے تو اس کا سارا پانی پی جائیں گے‘ اور ان کا

آخری شخص جب اس سے گزرے گا تو کہے گا کہ یہاں بھی کبھی پانی ہوا کرتا تھا! اور اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی (طور میں) محصور ہو جائیں گے‘ یہاں تک کہ ایک بیل کا سر ان کے نزدیک سو دینار سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ پس اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ کی طرف رجوع کریں گے تو اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں ایک پھنسی پیدا کریں گے تو وہ سب کے سب ایک ساتھ مر جائیں گے۔ زمین میں ایک بالشت برابر زمین بھی ایسی نہیں بچے گی کہ جہاں ان کی بدبو نہ ہو۔ پس اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ کی طرف رجوع کریں گے تو اللہ تعالیٰ بختی اونٹ کی گردنوں جیسے پرندے بھیجیں گے جو انہیں اٹھا کر وہاں پھینک دیں گے‘ جہاں اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔‘‘

اس روایت میں خان صاحب کے لیے اُس سطحی تاویل کی گنجائش بھی باقی نہیں ہے کہ جس کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت ایک عام مصلح کی سی ہے اور ان کا ظہور ہو چکا ہے۔ اس روایت میں جس عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد یاجوج ماجوج کا خروج بتلایا گیا ہے‘ ان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ’اللہ کے نبی ہوں گے۔

اسی طرح خان صاحب نے یاجوج ماجوج کے بحیرۂ طبریہ کے پانی پی جانے کی تاویل اہلِ مغرب کے پٹرول کے ذخائر پر قبضہ کرنے سے کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’دریا کا پانی پی جانے سے مراد غالباً پٹرول کے ذخائر ہیں۔ ان ذخائر کا بڑا حصہ مشرقی دنیا میں تھا‘ لیکن جس انڈسٹری میں ان کی کھپت تھی‘ وہ زیادہ تر مغربی دنیا میں واقع تھی۔ اس لیے اہلِ مغرب کو یہ موقع ملا کہ وہ تیل کے قدرتی ذخیروں کو اپنے یہاں لے جا کر ان کو بھرپور طور پر استعمال کر سکیں۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۳)

اب پٹرول کی پانی سے وجہ مناسبت کسی بھی صاحبِ عقل کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور خود اسی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ ان کا آخری شخص یہ کہے گا کہ یہاں کبھی پانی ہوا کرتا تھا‘ جبکہ پٹرول تو اب بھی مشرق میں موجود ہے۔

پھر یہ بھی کہ شارحین حدیث نے بحیرہ طبریہ کا علاقہ اُردن اور شام میں بتلایا ہے اور پٹرول کے سب سے بڑے ذخائر وینزویلا میں ہیں‘ جبکہ دوسرے نمبر پر سعودی عرب اور تیسرے نمبر پر کینیڈا میں ہیں۔ پٹرول کے پہلے اور تیسرے بڑے ذخیرے کا تعلق تو مغرب ہی سے ہے اور دوسرے کا تعلق بھی اردن یا شام سے نہیں ہے‘ بلکہ اردن یا شام تو اوپیک (OPEC) ممالک میں شامل ہی نہیں ہیں۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یاجوج ماجوج سے قتال نہ کرسکنا' ان کا کوہ طور پر محصور ہوجانا' اللہ تعالیٰ کا یاجوج ماجوج کو ایک ساتھ وبائی مرض سے ہلاک کرنا اور ان کی لاشوں کو بختی اونٹ کے سروں جیسے پرندوں کا اٹھا کر لے جانا وغیرہ' کہاں کہاں خان صاحب روایات کے حقائق کی مسخ شدہ تاویلات پیش کریں گے؟

دابۃ الارض کا ظہور

قیامت کی نشانیوں میں ہمیں ایک ایسے جانور کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو زمین سے نکلے گا اور لوگوں سے کلام کرے گا۔ مولانا وحید الدین خان صاحب اس جانور کے بارے بھی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ اس سے مراد بھی اُمت محمدیہ ﷺ کا ایک داعی اور مصلح فرد ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''دابہ کے سلسلے میں مختلف روایتیں آئی ہیں۔ ان روایتوں سے بظاہر یہ متصور ہوتا ہے کہ دابہ ایک انوکھی مخلوق ہوگا۔ ان روایتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو تمثیلی اسلوب قرار دے کر سمجھا جائے۔ چنانچہ مفسرین کی ایک جماعت نے ان روایتوں کو تمثیل پر محمول کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ دابہ سے مراد انسان ہے' نہ کہ کوئی عجیب الخلقت جانور۔ اس کے مطابق' عام انسانوں جیسا ایک انسان ہوگا اور خدا کی خصوصی توفیق کے ذریعے خدا کی نشانیوں کے اظہار کا ذریعہ بنے گا۔ مفسر قرطبی (وفات: ۶۷۱ھ) نے اس رائے کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے: أن الأقرب أن تكون هذه الدابة إنسانا متكلما' يناظر أهل البدع والكفر ويجادلهم لينقطعوا' فيهلك من هلك عن بينة' ويحيا من حي عن بينة.'' (ماہنامہ الرسالہ' مئی ۲۰۱۰' ص ۵۶)

دابۃ الارض کی ایک اور مقام پر وضاحت کرتے ہوئے خان صاحب لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ داعی ہے جو اُمتِ مسلمہ پر اِتمامِ حجت کے لیے آئے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اسی طرح گویا دابہ یا دورِ آخر میں ظاہر ہونے والا داعی' اللہ کی طرف سے لوگوں کے اوپر آخری اتمام حجت ہوگا۔ اس اِتمام حجت کے بعد دوسرا واقعہ صرف یہ ہوگا کہ فرشتہ اسرافیل اپنا صور پھونک دے اور اور قیامت برپا ہو جائے۔ (ماہنامہ الرسالہ' مئی ۲۰۱۰ء' ص ۵۷)

دابہ سے مافوق الفطرت مخلوق مراد ہے نہ کہ داعی انسان' جیسا کہ خان صاحب کا خیال ہے۔ ایک روایت میں دابہ کی یوں صفات بیان کی گئی ہیں:

((تَخْرُجُ الدَّابَّةُ' فَتَسِمُ النَّاسَ عَلٰى خَرَاطِيْمِهِمْ' ثُمَّ يَعْمُرُوْنَ فِيْكُمْ حَتّٰى

يَشْتَرِيَ الرَّجُلُ الْبَعِيْرَ' فَيَقُوْلُ: مِمَّنِ اشْتَرَيْتَهُ؟ فَيَقُوْلُ: اشْتَرَيْتُهُ مِنْ اَحَدِ الْمُخَطَّمِيْنَ)) (مسند أحمد: ٦٤٧/٣٦' مؤسسة الرسالة' الطبعة الثانية)

''دابہ کا خروج ہوگا اور وہ لوگوں کی ناک پر نشان لگا دے گا (یعنی مؤمن کی ناک پر ایک خاص قسم کا نشان لگائے گا اور کافر کی ناک پر ایک دوسری قسم کا نشان لگائے گا)۔ پس ان نشان لگے ہوؤں کی تم میں اس قدر کثرت ہوجائے گی کہ ایک شخص ایک اونٹ خریدے گا اور دوسرا کہے گا کہ تم نے کس سے یہ اونٹ خریدا ہے تو پہلا کہے گا کہ ناک پر نشان لگے ہوؤں میں سے ایک سے خریدا ہے۔''

اگر دابہ سے مراد انسان ہو تو انسان کے کلام کرنے میں نشانی والی کیا بات ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے کلام کرنے والے دابہ کو بطورِ خاص قیامت کی نشانیوں میں شمار کیا ہے۔ اور پھر دابۃ الارض اگر لوگوں کی ناک پر کافر یا مؤمن ہونے کے نشانات لگائے تو اس کا قیامت کی نشانی ہونا سمجھ آتا ہے' لیکن ایک داعی کے کسی کافر یا مؤمن کے ناک ہی پر نشان لگانے کا کیا معنی ہے؟ اور پھر اونٹ خریدنے کے ایک عام واقعہ کو اس روایت کا حصہ بنانے میں کیا تعلیم مقصود ہے؟ اس کی تاویلات تا حال خان صاحب کی توجہ کی منتظر ہیں۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((ثَلَاثٌ اِذَا خَرَجْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا: طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَالدَّجَّالُ وَدَابَّةُ الْاَرْضِ)) (صحيح مسلم' كتاب الإيمان' باب بيان الزمن الذى لا يقبل فيه الإيمان)

''تین چیزوں کا جب ظہور ہوجائے گا تو اس وقت کسی بھی جان کو جو کہ اس سے پہلے ایمان نہ لائی ہو یا اس نے حالت ایمان میں کوئی نیکی نہ کی ہو' اس کا ایمان لانا فائدہ نہ دے گا: سورج کا مغرب سے طلوع ہونا' دجال کا ظہور اور دابۃ الارض کا نکلنا۔''

خان صاحب اس روایت کی کیا تاویل فرماتے ہیں کہ دورِ آخر کے اس داعی دابۃ الارض کے ظہور کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ باقی رہ گیا یا نہیں؟ اگر رہ گیا ہے تو اس روایت کا مفہوم کیا ہے؟ اور اگر نہیں تو وہ داعی اپنی دعوت سے کر کیا رہا ہے؟

اسی طرح خان صاحب نے امام قرطبی رحمہ اللہ سے یہ قول تو نقل کر دیا کہ بعض متاخرین کا خیال ہے کہ دابہ سے مراد انسان ہے' لیکن امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس قول پر اپنے شیخ سے جو نقد نقل کی ہے' اس کی طرف اشارہ کرنا بھی خان صاحب نے پسند نہیں فرمایا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ اس

قول کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"قال بعض المتأخرين من المفسرين : إن الأقرب أن تكون هذه الدابة انسانا متكلما يناظر أهل البدع والكفر ويجادلهم لينقطعوا' فيهلك من هلك عن بينة ويحيا من حي عن بينة. قال شيخنا الإمام أبو العباس أحمد بن عمر القرطبي في كتاب المفهم له : وإنما كان عند هذا القائل الأقرب لقوله تعالىٰ "تكلمهم" وعلى هذا فلا يكون في هذه الدابة آية خاصة خارقة للعادة' ولا يكون من العشر الآيات المذكورة في الحديث' لأن وجود المناظرين والمحتجين على أهل البدع كثير' فلا آية خاصة بها فلا ينبغي أن تذكر مع العشر' وترتفع خصوصية وجودها إذا وقع القول' ثم فيه العدول عن تسمية هذا الإنسان المناظر الفاضل العالم الذي على أهل الأرض أن يسموه باسم الإنسان أو بالعالم أو بالإمام إلى أن يسمى بدابة' وهذا خروج عن عادة الفصحاء' وعن تعظيم العلماء' وليس ذلك دأب العقلاء' فالأولى ما قاله أهل التفسير' والله أعلم بحقائق الأمور." (تفسير القرطبي : ۲۳٦/۱۳' دار الكتب المصرية' القاهرة' الطبعة الثانية' ۱۹٦٤ء)

''بعض متاخرین مفسرین کا خیال ہے کہ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ دابۃ الارض سے مراد وہ متکلم انسان ہو جو اہلِ کفر اور اہلِ بدعت سے مناظرہ اور مکالمہ کرتا ہے تاکہ ان کی دلیل ختم ہو جائے اور جس نے زندہ رہنا ہے وہ دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور جس نے مرنا ہے وہ دلیل کے ساتھ مر جائے۔ ہمارے شیخ ابوالعباس احمد بن عمر قرطبی نے اپنی کتاب 'المفہم' میں لکھا ہے کہ اس قول کے قائلین کی بہترین دلیل 'تُكَلِّمُهُمْ' کے الفاظ ہیں کہ وہ دابہ کلام کرنے والا ہوگا۔ اگر تو دابہ سے مراد انسان لیا جائے تو پھر اس دابہ کے خروج کے خرقِ عادت ہونے کی کوئی وجہ سمجھ سے بالاتر ہے اور اس کا قیامت کی دس نشانیوں میں ذکر کرنا بھی سمجھ میں نہیں آتا' کیونکہ اہلِ بدعت کے ساتھ مناظرہ کرنے والے تو بہت زیادہ ہیں (اور دابہ جس کا ذکر قرآن میں ہے' وہ ایک ہے)' پس اس صورت میں آیت میں کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی اور دابۃ الارض کے قیامت کی دس نشانیوں میں ذکر کی وجہ بھی درست معلوم نہیں ہوتی اور (انسان مراد لینے کی صورت میں) خاص طور پر اس کا ظہور اس وقت جبکہ قیامت واقع ہو' سمجھ سے بالاتر

ہے۔ پھر اگر اس سے مراد انسان لے بھی لیا جائے تو پھر یہ بات سمجھ نہیں آتی ہے کہ عالم' فاضل' مناظر اور امام کے رتبے پر فائز انسان کو دابہ یعنی جانور کہہ دیا گیا ہے۔ فصحائے عرب کی یہ عادت نہیں ہے اور نہ ہی اس میں علماء کی کوئی تعظیم ہے کہ انہیں دابہ سے تشبیہ دی جائے۔ اسی طرح اہلِ عقل کی بھی یہ عادت نہیں ہے کہ انسان کو دابہ سے پکاریں۔ پس بہترین قول وہی ہے جو اہلِ تفسیر کا ہے اور اللہ تعالیٰ حقائق کا علم بہتر جانتا ہے۔''

دریائے فرات سے سونے کا خزانہ برآمد ہونا

قیامت کی نشانیوں میں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے کہ دریائے فرات سے سونے کا خزانہ برآمد ہوگا۔ خان صاحب اس روایت کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک روایت کے مطابق' پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: ((يُوْشِكُ الْفُرَاتُ اَنْ يَحْسِرَ عَنْ كَنْزٍ مِنْ ذَهَبٍ)) (صحیح مسلم' کتاب الفتن) یعنی وہ زمانہ آنے والا ہے' جب کہ دریائے فرات میں سونے کا ایک خزانہ نکلے۔ اس حدیث میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے' اس سے واضح طور پر پٹرول مراد ہے' جس کو موجودہ زمانے میں سیال سونا (liquid gold) کہا جاتا ہے اور جو بہت بڑی مقدار میں شرقِ اوسط کے عرب علاقے میں ظاہر ہوا ہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ' مئی ۲۰۱۰ء' ص ۵۸)

خان صاحب نے یہاں بھی حسب عادت مکمل روایت نقل نہیں کی ہے اور صرف اتنا حصہ ہی نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ جس سے ان کی تاویل پر کوئی اعتراض قاری کے ذہن میں پیدا نہ ہو۔ مکمل روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

((يُوْشِكُ الْفُرَاتُ اَنْ يَحْسِرَ عَنْ كَنْزٍ مِنْ ذَهَبٍ' فَمَنْ حَضَرَهُ فَلَا يَاْخُذْ مِنْهُ شَيْئًا)) (صحيح البخاري' كتاب الفتن' باب خروج النار۔ وصحيح مسلم' كتاب الفتن واشراط الساعة' باب لا تقوم الساعة حتى يحسر الفرات عن جبل من ذهب)

''قریب ہے کہ فرات سے سونے کا ایک خزانہ برآمد ہو اور جو شخص بھی اس کے پاس موجود ہو وہ اس میں سے کچھ نہ لے۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے اس سونے کے خزانے سے کچھ لینے سے منع فرمایا ہے۔ اگر تو اس کی تاویل تیل یا پٹرول سے کی جائے تو یہ تو ضروریاتِ زندگی میں سے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ اسے حاصل کرنے سے کیسے منع فرما سکتے ہیں؟ اگر تو 'ذہب' سے مراد تیل ہی ہے تو

خان صاحب کو عرب مسلمان ممالک کی حکومتوں کو مشورہ دینا چاہیے کہ فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق وہ اس سونے کو ہاتھ بھی نہ لگائیں اور بہتر ہے کہ اہل مغرب کے لیے چھوڑ دیں۔

اس روایت کے اسلوب بیان ہی سے واضح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سونے کے خزانے کے ظہور کو ایک فتنہ اور آزمائش قرار دیا ہے' اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ لینے سے منع فرمایا ہے۔ اور اس کا فتنہ ہونا سونا مراد لینے کی صورت میں ہی بہتر طور پورا ہوسکتا ہے۔

دُخان یا دھواں

قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی 'دخان' بھی بیان کی گئی ہے اور یہ مؤمنین کے لیے آزمائش اور کفار کے لیے عذاب کی صورت میں نازل ہوگا۔ خان صاحب اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک روایت کے مطابق' پیغمبر اسلام ﷺ نے قربِ قیامت کی دس نشانیوں کا ذکر فرمایا۔ اُن میں سے ایک نشانی دخان کا ظاہر ہونا ہے۔ دخان کے لفظی معنی دھواں کے ہیں۔ اس روایت میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا' جب کہ زمین کی پوری فضا دھویں سے بھر جائے گی۔ موجودہ زمانے میں یہ پیشین گوئی واقعہ بن چکی ہے۔ اس سے مراد واضح طور پر وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں فضائی کثافت (air pollution) کہا جاتا ہے۔ جدید صنعتی دور نے تاریخ میں پہلی بار وہ چیز پیدا کی ہے جس کو کاربن ایمیشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پوری فضا کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھر گئی ہے' جو انسان جیسی مخلوق کے لیے انتہائی حد تک مہلک ہے۔ فضائی کثافت کا یہ معاملہ پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ناقابل تصور تھا۔'' (ماہنامہ الرسالہ' مئی ۲۰۱۰ء' ص ۵۹)

'دخان' کا ایک جزوی مصداق قریش مکہ پر قحط سالی کا آنے والا عذاب تھا' جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قریش مکہ کے اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت قبول نہ کرنے پر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے خلاف بددعا کی کہ ان پر ایسی قحط سالی کا عذاب آئے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قوم پر آیا تھا۔ پس قریش اس قحط سالی کی وجہ سے مُردار اور ہڈیاں کھانے پر مجبور ہو گئے اور انہیں زمین کی خشکی اور بھوک کے سبب سے زمین و آسمان کے مابین دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ (صحیح البخاری' کتاب التفسیر' باب سورۃ الروم)

اس علامت کا کامل مصداق قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا' جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْنَ عَشْرَ آيَاتٍ : الدُّخَانُ وَالدَّجَّالُ وَالدَّابَّةُ وَطُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُوْلُ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَيَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَثَلَاثُ خُسُوْفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنْ قِبَلِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلٰى مَحْشَرِهِمْ))

(مسند أحمد : ٦٣/٢٦)

''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ دس علامات واقع نہ ہو جائیں۔ دخان' دجال' دابۃ الارض' سورج کا مغرب سے طلوع ہونا' نزولِ عیسیٰ ابن مریم' یاجوج ماجوج' تین خسوف' ایک مشرق' دوسرا مغرب اور تیسرا جزیرہ نما عرب میں' اور آخری نشانی وہ آگ ہے جو ایک طرف سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانک کر ان کے محشر میں جمع کر دے گی۔''

اللہ کے کلمہ کا غلبہ

روایات میں قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اللہ کا دین ہر کچے پکے مکان پر غالب ہو کر رہے گا۔ خان صاحب اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ اس زمانے میں اسلام کا کلمہ دنیا کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں داخل ہو جائے گا (لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ)۔ اس سلسلے میں مزید یہ الفاظ آئے ہیں: بِعِزِّ عَزِيْزٍ' وَذُلِّ ذَلِيْلٍ (مسند أحمد' جلد ٥' ص ٤)۔ یعنی عزت والے کو عزت کے ساتھ اور ذلت والے کو ذلت کے ساتھ۔ اس سے مراد سیاسی طاقت نہیں ہے۔ یہ ایک اسلوبِ کلام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہی نہ خواہی یعنی کوئی شخص چاہے یا نہ چاہے' اسلام کا کلمہ بہر حال اس کے گھر میں داخل ہو جائے گا۔ یہ واقعہ کس طرح ہوگا۔ کمپیوٹر ایج نے اس بات کو پوری طرح قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ عملاً ہر گھر میں اور ہر آفس میں کمپیوٹر داخل ہو گیا ہے۔ انٹرنیٹ اور ویب سائیٹ پر تمام اسلامی معلومات بھری جا رہی ہیں۔ اب دنیا کے کسی بھی مقام پر اور کسی بھی آفس یا گھر میں ایک شخص اپنے کمپیوٹر کے ذریعے' اسلام کے بارے میں پوری معلومات خود اپنی زبان میں حاصل کر سکتا ہے۔ اس معاملے پر غور کرتے ہوئے سمجھ

میں آتا ہے کہ ہر گھر میں کلمہ اسلام کے داخلے سے مراد امکانی داخلہ (potential entry) ہے‘ نہ کہ واقعی داخلہ (actual entry)۔ اور امکانی داخلے کے اعتبار سے بلاشبہ اسلام کا کلمہ ہر گھر میں داخل ہو چکا ہے۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۶۱-۶۲)

مسند احمد کی مذکورہ بالا روایت کہ جس کی خان صاحب نے تاویل کی ہے‘ کی مکمل عبارت یوں ہے:

((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِيْلٍ‘ اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا)) (مسند أحمد: ۲۳۶/۳۹‘ مؤسسة الرسالة‘ الطبعة الثانية‘ ۱۹۹۹ء)

’’زمین کی پشت پر کوئی کچا یا پکا مکان باقی نہ رہے گا لیکن اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کے کلمہ کو داخل کر دے گا‘ عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ‘ یا تو اللہ تعالیٰ انہیں عزت بخشے گا اور وہ اسلام کا کلمہ قبول کر لیں گے یا پھر انہیں ذلیل و رسوا کرے گا اور وہ اس کلمے کی اطاعت قبول کر لیں گے۔‘‘

خان صاحب نے حسب عادت یہاں بھی اپنے اقتباس میں روایت کا وہ حصہ نقل نہیں کیا جو کلمہ کے غلبے کا معنی متعین کرنے میں اہم حیثیت کا حامل تھا۔ روایت میں ’فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا‘ کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ یہاں کلمہ کے غلبہ سے مراد اس کا بالفعل اور سیاسی غلبہ مراد ہے۔ مسند احمد ہی کی ایک روایت میں ’لَيَبْلُغَنَّ هٰذَا الْاَمْرُ‘ کے الفاظ بھی ہیں کہ جن میں لفظ ’امر‘ اس کلمہ کی سیاسی غلبے کی حیثیت کو واضح کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں اسی روایت کے آخر میں راوی حدیث جناب تمیم داری رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

’’وَكَانَ تَمِيْمٌ الدَّارِي يَقُوْلُ قَدْ عَرَفْتُ ذٰلِكَ فِيْ اَهْلِ بَيْتِيْ لَقَدْ اَصَابَ مَنْ اَسْلَمَ مِنْهُمُ الْخَيْرُ وَالشَّرْفُ وَالْعِزُّ وَلَقَدْ اَصَابَ مَنْ كَانَ مِنْهُمْ كَافِرًا الذُّلُّ وَالصِّغَارُ وَالْجِزْيَةُ‘‘ (مسند أحمد: ۱۵۵/۲۸)

تمیم داری رضی اللہ عنہ (یہ روایت نقل کرنے کے بعد) کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے گھر والوں کے بارے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی مکمل پائی کہ جس نے ان میں اسلام قبول کر لیا تو اسے شرف و خیر اور بزرگی حاصل ہوئی اور جو ان میں کافر رہا تو وہ ذلیل و حقیر رہا اور جزیہ ادا کرتا رہا۔‘‘

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو آپ کے ارشادات کے اولین مخاطب تھے‘ وہ بھی اس روایت کے مفہوم سے سیاسی غلبہ ہی مراد لیتے تھے‘ ورنہ تو جزیہ ادا کرنے کی بات کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔ صحابی رسول تمیم داری رضی اللہ عنہ نے اس روایت کا جو معنی بیان کیا ہے‘ وہ اس روایت کا ایک جزوی مصداق ہے جبکہ اس کے کامل مصداق کا ظہور قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَنْزِلَ فِيْكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا‘ فَيَكْسِرَ الصَّلِيْبَ‘ وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ وَيَفِيْضَ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهُ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا)) ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْ هُرَيْرَةَ وَاقْرَؤُوْا اِنْ شِئْتُمْ: ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾)) (صحيح البخاری‘ كتاب أحاديث الأنبياء‘ باب نزول عيسى بن مريم)

’’اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے‘ عنقریب تمہارے مابین عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ایک عادل حکمران کی صورت میں نازل ہوں گے۔ وہ صلیب کو توڑ دیں گے۔ خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ جزیہ کو ختم کر دیں گے۔ مال کی اس قدر کثرت ہو جائے گی کہ اسے کوئی قبول کرنے والا باقی نہ رہے گا۔ اور ایک سجدہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بہتر سمجھا جائے گا۔‘‘ یہ روایت نقل کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو: ’’اور اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے‘ اور وہ قیامت والے دن ان پر گواہ ہوں گے۔‘‘

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((ثُمَّ يَمْكُثُ النَّاسُ سَبْعَ سِنِيْنَ لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ)) (صحيح مسلم‘ كتاب الفتن و أشراط الساعة‘ باب فی خروج الدجال .....

’’پھر لوگ سات سال تک اس طرح رہیں گے کہ دو افراد کے مابین بھی دشمنی نہیں ہوگی۔‘‘

خان صاحب نے اسلام کے کلمہ کے غلبہ کی جو تاویل پیش کی ہے یعنی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے اسلام کے پیغام کا ہر گھر تک پہنچنا‘ اس معنی میں تو اسلام کے علاوہ کفر کا کلمہ بھی ہر کچے پکے مکان میں داخل ہو گیا ہے‘ بلکہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے اصلاً تو کفر کا کلمہ ہی داخل

ہوا ہے اور اسلام تو برائے نام ہے۔ پس اس تاویل کی صورت میں اللہ کے کلمہ کے غلبے کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

کلمہ گو مسلمان کا باقی نہ رہنا

بعض روایات کے مطابق قربِ قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ زمین پر کوئی کلمہ گو مسلمان باقی نہ رہے گا اور قیامت' کفار اور شریر قسم کے لوگوں پر قائم ہوگی۔ خان صاحب نے اس کی بھی تاویل کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک روایت کے مطابق' پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ : اللّٰهُ ' اللّٰهُ)) (صحيح مسلم' كتاب الإيمان' الترمذی' كتاب الفتن) یعنی قیامت صرف اُس وقت قائم ہوگی جب کہ زمین پر کوئی اللہ' اللہ کہنے والا باقی نہ رہے۔ اس حدیث میں قول سے مراد قول لسان نہیں ہے' بلکہ قولِ معرفت ہے' جیسا کہ قرآن (المائدۃ: ۸۳) سے ثابت ہوتا ہے..... موجودہ زمانے میں ایسے لوگ تو کثرت سے ملیں گے جو تکرارِ لسان کے طور اللہ کا نام لیں گے' مگر اللہ کے نزدیک ایسے لوگوں کی کوئی قیمت نہیں' اور جہاں تک حقیقی معنوں میں اللہ کو یاد کرنے کا سوال ہے' ساری زمین پر بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو اس معاملے میں مطلوب معیار پر پورے اتریں۔'' (ماہنامہ الرسالہ' مئی ۲۰۱۰ء' ص ۶۰-۶۱)

خان صاحب کی یہ تاویل اللہ کے رسول ﷺ کے ان صریح ارشادات کے خلاف ہے جن میں کلمہ سے مراد 'کلمہ لسانی' لیا گیا نہ کہ معرفت کا کلمہ' جیسا کہ خان صاحب کا بیان ہے—

ایک روایت کے مطابق نزولِ عیسیٰ ابن مریم اور قتل دجال کے بعد اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجیں گے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

((ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ رِيْحًا بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّامِ ' فَلَا يَبْقٰى عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ اَوْ اِيْمَانٍ اِلَّا قَبَضَتْهُ' حَتّٰى لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ دَخَلَ فِيْ كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ' حَتّٰى تَقْبِضَهٗ)) (صحيح مسلم' كتاب الفتن و أشراط الساعة' باب فی خروج الدجال .....)

''پھر اللہ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیجے گا اور زمین کی سطح پر کوئی ایک شخص بھی ایسا باقی نہ رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو۔ یہاں تک کہ اگر تم (اہل ایمان) میں سے کوئی ایک شخص پہاڑ کی کھوہ میں بھی گھس جائے گا تو وہ ہوا اس میں بھی

داخل ہو کر اسے قبض کر لے گی۔''

ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے:

((ثُمَّ يَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ عَلَيْهِمْ تَقُوْمُ السَّاعَةُ)) (صحيح مسلم' كتاب الإمارة' باب قوله لاتزال طائفة من أمتی ظاهرين على الحق.....)

''پھر بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے اور ان پر قیامت قائم ہوگی۔''

بیت اللہ کو آگ لگانا

قیامت کی نشانیوں میں یہ بھی روایات میں بیان ہوا ہے کہ بیت اللہ کو آگ لگائی جائے گی۔ خان صاحب اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک روایت کے مطابق' پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدَ قَلِيْلٍ اَمْرًا عَظِيْمًا' يُحَرَّقُ الْبَيْتُ' وَيَكُوْنُ وَيَكُوْنُ (صحيح مسلم' كتاب الفتن)۔ یعنی آئندہ تم ایک امر عظیم دیکھو گے' وہ یہ کہ ایک گھر جلا دیا جائے گا۔ ایسا ہوگا اور ضرور ہو گا۔ حدیث کے الفاظ پر غور کیجیے تو یہ کسی عام گھر کو جلانے کی بات نہیں ہے' بلکہ وہ ایک بہت بڑے گھر کو جلانے کی بات ہے' جیسا ''گھر'' قدیم زمانے میں موجود نہ تھا۔ اس پیشین گوئی سے غالباً وہ واقعہ مراد ہے جو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک (امریکا) میں پیش آیا... اس انوکھی پیشین گوئی کا حرف بہ حرف پورا ہونا' اس بات کی یقینی علامت ہے کہ اب قیامت کا وقت قریب آچکا ہے' اس کے آنے میں اب زیادہ دیر نہیں۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء' ص ۵۹-۶۰)

قابل غور بات یہ ہے کہ روایات میں 'البیت' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس میں الف' لام تعریف کا ہے اور شرعی عرف میں 'البیت' سے مراد 'بیت اللہ' ہی ہوتا ہے' جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ﴾ (البقرة : ۱۵۸)

''پس جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا۔''

اسی طرح آیات مبارکہ ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ (آل عمران:۹۷) اور ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ﴾ (الانفال : ۳۵) اور ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳﴾ (قریش) وغیرہ میں بھی 'البیت' سے مراد بیت اللہ ہی ہے۔ پس اس لفظ کے شرعی عرف کی روشنی میں اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان میں بھی 'البیت' سے مراد بیت اللہ ہی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے اولین مخاطبین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے‘ لہٰذا آپ کے ارشادات کا کوئی ایسا معنی و مفہوم بیان کرنا جس کا ادراک اولین مخاطبین کے لیے ناممکن ہو‘ درست نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اس روایت کے معنی و مفہوم کا ادراک اوّلین مخاطبین ہی کے لیے ناممکن ہو تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے کلام ہی کیوں فرمایا؟ پس خان صاحب نے ’البیت‘ کی جو تاویل کی ہے وہ ایسا معنی ہے کہ جس کا ادراک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا‘ لہٰذا اس تاویل کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہؓ سے ایک ایسا کلام فرمایا ہے جس کا معنی و مفہوم جاننا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ **فیا للعجب!**

وقوعِ قیامت

مولانا وحید الدین خان صاحب کے بقول قیامت کی تقریباً تمام علامات ظاہر ہو چکی ہیں اور اب اس کے وقوع کا وقت بہت ہی قریب ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ گلوبل وارمنگ (global warming) کے نتیجے میں ۲۰۵۰ء تک قیامت کے واقع ہونے کے قوی امکانات ہیں:

’’موجودہ زمانے میں گلوبل وارمنگ کے نتیجے میں جو کلائمیٹ چینج کا واقعہ پیش آ رہا ہے‘ اس کی روشنی میں مغربی سائنس داں یہ کہہ رہے ہیں کہ ۲۰۱۰ء تک موجودہ دنیا کا لائف سپورٹ سسٹم بہت زیادہ بگڑ جائے گا‘ اور ۲۰۵۰ء تک شاید زمین پر ہر قسم کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ ستمبر ۲۰۰۷ء‘ ص ۱۰)

ایک اور جگہ ۲۰۵۰ء تک قیامت کے واقع ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’اکیسویں صدی کے آتے ہی دنیا بھر کے سائنس دانوں نے اپنے مطالعے کے مطابق‘ متفقہ طور پر یہ اعلان کرنا شروع کر دیا ہے کہ زمین میں گلوبل وارمنگ اور موسمیاتی تبدیلی کے نتیجے میں نہایت تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ جدید سائنسی مشاہدات کے مطابق‘ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں یہ ہونے والا ہے کہ تقریباً ۲۰۵۰ء سے پہلے ہی ہماری زمین ناقابل رہائش (inhabitable) ہو جائے۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۵۵)

خان صاحب کا یہ نقطہ نظر بھی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے خلاف ہے۔ ایک تو کسی شخص کو وقوعِ قیامت کی تاریخ یا سن طے نہیں کرنا چاہیے‘ کیونکہ اس کا یقینی علم اللہ ہی کے پاس ہے اور رسولوں کو بھی اس کا متعین علم نہیں دیا گیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان: ۳۴)

’’بلاشبہ اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔‘‘

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۸۷)

’’وہ آپ سے قیامت کے بارے سوال کرتے ہیں کہ وہ کب واقع ہو گی۔ آپ کہہ دیجیے: اس کا علم صرف میرے ربّ ہی کے پاس ہے۔ اسے اس کے وقت پر کوئی ظاہر نہیں کرے گا سوائے اُس کے۔‘‘

﴿لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ﴾ میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ قیامت اپنے وقت پر خوب روشن ہو کر سامنے آئے گی‘ یعنی اس کی علامات خوب روشن ہوں گی نہ کہ ایسی کہ جن کے لیے باطنی تاویلات کی ضرورت محسوس ہو۔

اسی طرح بلاشبہ قیامت قریب ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرما دیا تھا کہ میرے اور قیامت کے مابین اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ دو انگلیوں کے مابین ہے۔ (صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب قول الرسول ﷺ بعثت أنا والساعة كهاتين)۔ اور یہ دو انگلیوں کا فاصلہ بھی اللہ کے امر میں چودہ سو سال سے زیادہ پر محیط ہے۔ پس قرب سے مراد بھی اللہ کا قرب ہے اور اللہ کے قرب کی تعیین انسان کے لیے کرنا مشکل بلکہ ناممکن امر ہے۔

(جاری ہے)

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے اشاعت عام: 25 روپے

ہمارے خلاف باقاعدہ اتحاد وجود میں آچکا ہے۔ اور اہم ترین بات یہ کہ افغانستان میں امریکی شکست اُسے حواس باختہ کر چکی ہے۔ امریکی صدارتی انتخابات چند ماہ تک ہونے کو ہیں۔ اوباما انتظامیہ کو اپنی مقبولیت میں اضافے کے لیے اس خطہ میں ایسی کارروائی کی ضرورت ہے جس سے افغانستان کی شکست پس منظر میں چلی جائے۔

ایسے نازک وقت میں جب ملکی سلامتی کو اندرونی و بیرونی خطرات درپیش ہیں ہمارے سیاست دانوں کو ایسے کھیل میں کودنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے ہوئے ملکی سلامتی کو داؤ پر نہ لگائیں۔ اگرچہ ہم مغربی جمہوریت اور انتخابی طریق کار کو اپنے ملکی مسائل کا حل نہیں سمجھتے لیکن وقتی طور پر اس فوری اور ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہماری رائے ہے کہ فوری طور پر عام انتخابات کا اعلان کر دیا جائے جو خود مختار الیکشن کمیشن اور فوج کی مشترکہ نگرانی میں ہوں' تاکہ باہمی کشمکش کا خاتمہ ہو سکے اور نئی حکومت قائم ہو' چاہے وہ موجودہ حکمران ہی کیوں نہ تشکیل دیں۔ اس لیے کہ تازہ مینڈیٹ کی وجہ سے اندرونی اور بیرونی مسائل کا حل نکالنے میں کامیابی کے کسی قدر زیادہ امکانات ہیں۔ البتہ اس کی مثال بالکل اس طرح ہے جیسے کسی موذی مرض میں مبتلا انسان کو اگر اچانک تیز بخار ہو جائے تو ڈاکٹر فوری طور پر بخار کم کرنے کی کوشش کرے گا اور اُس کی موذی مرض سے مستقل شفایابی کے لیے انتہائی سوچ بچار اور غور و خوض کے بعد ایک منصوبے کے تحت علاج کرے گا۔ البتہ وطن عزیز جن گھمبیر مسائل سے دوچار ہے اور اُس کی سلامتی کو جو خوفناک خطرات درپیش ہیں اُن سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس بنیادی غلطی کا ازالہ کرنا ہوگا جس کی وجہ سے ملک آج اس حالت کو پہنچا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی تعمیر اُس بنیاد پر نہیں ہوئی جس کا ڈھنڈورا قیامِ پاکستان کے وقت بڑے زور و شور سے پیٹا گیا تھا۔ نظریہ پاکستان کیا تھا' پاکستان کے قیام کی بنیاد کس شے کو قرار دیا گیا تھا' اور اس نئے ملک کے قیام کی وجہ جواز کیا تھی' اسے اُس آئین ساز اسمبلی سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا جو قیامِ پاکستان سے ایک سال پہلے وجود میں آئی تھی اور پاکستان کے قیام کے کافی عرصہ بعد تک قائم رہی۔ اس اسمبلی نے 1949ء میں یعنی پاکستان بننے کے صرف دو سال بعد قراردادِ مقاصد منظور کی تھی' لیکن افسوس صد افسوس کہ بعد میں آنے

والوں نے گاڑی کو ریورس گیئر لگا دیا اور کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھنے کی بجائے مخالف سمت چل پڑا۔ لہٰذا یہ تباہی و بربادی اس بیک گیئر کی وجہ سے ہے۔ اگر قراردادِ مقاصد کو عملی شکل دی جاتی' اگر پاکستان میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی بالفعل قائم ہو جاتا تو آج جن قوموں اور ریاستوں کے سامنے ہم کشکول لیے پھرتے ہیں اور جن سے ہم اپنی سلامتی کی بھیک مانگتے ہیں تو ہماری یہ حالت نہ ہوتی اور ہم اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی پوزیشن میں ہوتے۔ کسی سپریم پاور کو ہمارے برادر ہمسایہ اسلامی ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ہم اللہ کے ہاں بھی سرخرو ہوتے اور دنیا میں بھی ہمیں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوتا۔ بہر حال انگریزی کے محاورے کے مطابق it is never too late to mend ابھی وقت ہے' ابھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ اسلام کی محفوظ چھتری تلے پناہ لے کر ہم اب بھی خود ایک سپر پاور بن سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ!

❁ ❁ ❁

بانی تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے
2004ء میں دورۂ انڈیا کے دوران دیئے گئے خطبات کا مجموعہ
خطباتِ ہند
1 امت مسلمہ کا ماضی حال اور مستقبل
2 امت مسلمہ کے لیے تین نکاتی لائحہ عمل
1 عظمت قرآن
Duties of True Momin 2 (English)
1 نجات کی راہ
2 نیکی کا قرآنی تصور
1 حب رسول ﷺ کے تقاضے
2 نفاق کی حقیقت
1 ایمان اسلام اور اللہ کی راہ میں جدوجہد
2 حقیقت واقسام شرک
1 برصغیر میں دعوت اسلام کے لیے مواقع
2 راہ ہدایت: ایمان کے ضمن میں فطرت اور عقل کی راہنمائی
1 خلافت کی حقیقت
2 خلافت کا معاشی نظام
3 اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام
4 ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے انٹرویو
7DVDs پر مشتمل سیٹ کی قیمت 420 روپے
مکتبہ خدام القرآن' لاہور
K-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: 3-35869501-42-92+
ای میل: maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org